رجسٹرڈ نمبر ایل ۵۲۰۳

شعبان المعظم ۱۳۷۰ھ

ترجمان القرآن

مرتبہ

سید ابوالاعلیٰ مودودی

دفتر رسالہ "ترجمان القرآن"

۵ - اے ذیلدار پارک، اچھرہ - لاہور

قیمت سالانہ چھ روپے

قیمت فی پرچہ دس آنے

رسائل و مسائل

از

سید ابو الاعلی مودودی

یہ کتاب مولانا مودودی کے ان مضامین پر مشتمل ہے جو ترجمان القرآن میں اسی عنوان کے تحت وقتاً فوقتاً شائع ہوتے رہے ہیں۔ چونکہ اسلام ایک مکمل نظام زندگی ہے اور اس میں انسانی زندگی کے تمام شعبوں کے مسائل کا حل موجود ہے اس وجہ سے ان مضامین پر مولانا نے ہر طرح کے سوالات قرآن و حدیث کی روشنی میں نہایت مدلل اور مفصل طریق پر دیئے ہیں۔ توقع ہے کہ یہ کتاب مسلمانوں کے تمام مکاتیب خیال کے لوگوں کے لئے جاذبیت کی حامل ہوگی۔

جلد شائع ہو رہی ہے

موضوعات مندرجہ ذیل ہیں

تفسیر آیات و تاویل احادیث	(۱۶)	مسائل کے جوابات
فقہی مسائل	(۳۴)	,,
خلافیات	(۱۵)	,,
عام مسائل	(۷)	,,
معاشی مسائل	(۱۵)	,,
سیاسی مسائل	(۱۰)	,,

ملنے کا پتہ

مرکزی مکتبہ جماعت اسلامی پاکستان

اچھرہ۔ لاہور

ترجمان القرآن لاہور

فہرست مضامین

جلد ۴۱	ربیع الاول ۱۳۷۳ھ مطابق دسمبر ۱۹۵۳ء	عدد ۳

ابوالخیر مودودی پرنٹر پبلشر نے پاکستان پرنٹنگ ورکس میں چھپوا کر دفتر ترجمان القرآن اچھرہ لاہور سے شائع کیا

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ط

اشارات

غیر ملکی اقتدار کے ہٹنے کے بعد اولین سوال جو کسی قوم کے سامنے آجاتا ہے، وہ یہ ہوتا ہے کہ اب زندگی کی تعمیر نو کس نظریے اور نقشے پر ہو؟

آزادی کی صبح اگر اپنے ساتھ کوئی ایسی حکمراں قوت لے کے آتی ہے جو خود اپنا کوئی نظریہ و اصول رکھتی ہو، کسی فلسفہ و نظام پر اس کا ایمان مضبوط ہو، اس کے بارے میں سالہا سال سے وہ مطالعہ و تفکر کرتی چلی آئی ہو، اپنے نظریہ و نظام کے لیے قربانیاں دے دے کر اس نے عوام کا اعتماد حاصل کر لیا ہو، اس کے تقاضوں کے مطابق جمہور کی تنظیم، تعلیم اور تربیت کی ہو، اسے سامنے رکھ کر تبدیلی کا کوئی نقشہ مرتب کیا ہو، پھر اس میں اپنے پروگرام کے لیے اتنا ولولہ اور اتنی تڑپ موجود ہو کہ وہ تذبذب اور تامل میں ایک پل بھی ضائع کیے بغیر اپنے مقصود تک جا پہنچنے کے لیے سر توڑ کوشش کرے اور مشکلات اور موانعات کا مقابلہ کرے، اس میں اتنی جرأت موجود ہو کہ وہ دنیا کی کسی طاقت سے مرعوب ہوئے بغیر اور ایک ایک قدم اٹھاتے ہوئے احساسِ کہتری کی نگاہ سے بین الاقوامی فضا کے تیور دیکھے بغیر اپنے سوچے سمجھے راستے پر گامزن ہو جائے تو نہ دستور کے بننے میں تاخیر ہوتی ہے، نہ تعمیر معاشرہ کا کام سالوں کے لیے تعطل میں رہ سکتا ہے اور نہ تبدیلی کے راستے میں جمود کی چٹانیں حائل ہو سکتی ہیں۔ رہنما پہلے منزل متعین کر چکے ہوں، قافلہ پہلے سے اقدام کرنے کے لیے پوری طرح تیار ہو تو آزادی کا جرس بجتے ہی اقدام شروع ہو جاتا ہے۔

لیکن ہمارے یہاں صورتِ حال بالکل الٹی ہے۔ یہاں قوم تو وہ بستی ہے جو اپنی فکری و عملی پستیوں کے لحاظ سے چاہے کیسی ہی تاریک گہرائیوں میں جا گری ہو، اسلام کی آئیڈیالوجی اور اسلام کے نظام

زندگی سے ذہنی و اعتقادی وابستگی رکھتی ہے اور نہ زندگی کو اسلام ہی کے سانچے میں ڈھلنے کے لیے وہ تحریک پاکستان کے لیے قربانیاں دے کر آزادی کے مقام پر پہنچی ہے۔ بدقسمتی سے اس کے اجتماعی بناؤ اور بگاڑ کے سارے اختیارات اور اس کی نمائندگی کے مناصب مسلم لیگ کی جس حکمراں طاقت کے قبضے میں ہیں، اُس کا حال یہ ہے کہ اوّل تو وہ سرے سے کوئی نظریہ و نظام اور تعمیر معاشرہ کا کوئی مستقل پروگرام اپنے پیشِ نظر رکھتی ہی نہیں، اور اگر اس کا پروگرام کوئی ہے تو وہ بہر حال اسلام کے نظریہ و نظام سے جدا کوئی چیز ہے۔ اسلام پر، جہاں تک اس کے اعمال اور اس کی کارگزاریاں شہادت دیتی ہیں وہ کم سے کم درجے کا ایمان و علم بھی نہیں رکھتی۔ حد سے حد اگر وہ اسلام کو جانتی یا مانتی ہے تو ایک انفرادی مت اور دھرم کی حیثیت سے جانتی اور مانتی ہے۔ لیکن اگر پورا زورِ استدلال صرف کر کے کوئی اس سے یہ منوا بھی لے کہ اسلام ایک مکمل نظامِ زندگی ہے تو وہ اس کا مجبورانہ اعتراف کرنے کے بعد یہ تسلیم کرنے پر ہرگز تیار نہیں ہوتی کہ یہ نظام موجودہ دَور کے حالات میں بھی چلنے اور کوئی بہتر نتائج دکھانے اور ترقی کا وسیلہ بننے کے قابل ہے۔ پھر اگر اس پر بھی قائل معقول کر لیا جائے تو ہر ہر قدم پر عذر در عذر، مشکل در مشکل اور سوال در سوال پیش کر کر کے زچ کر دینے کے لیے پوچھتی ہے کہ ہمیں بتاؤ کہ اس چیز کا اور اس چیز کا اور اس چیز کا حل کیا ہے۔ پھر اگر یہ حل بھی بتا دیا جاتا ہے تو پھر وہ یہ سوال لے کے سامنے آ جاتی ہے کہ اگر اسلام کو ہم اختیار کر لیں تو فلاں پڑوسی قوم کو اور فلاں مغربی طاقت کو کیسے راضی اور مطمئن کیا جا سکتا ہے۔ پھر جب استدلال کی بازی وہ پوری طرح ہر چکتی ہے تو پروپگنڈے کے ہتھیار لے کر میدان میں اترتی ہے۔ پھر جب یہ مرحلہ بھی طے ہو چکتا ہے تو سازشی طریقے اختیار کرتی ہے۔ پھر جب یہ طریقے بھی کارگر نہیں ہوتے تو تشدد کے لیے مستبدانہ اختیارات اور اندھے قوانین کے اسلحہ خانہ سے مدد لیتی ہے۔ آخر جب کوئی چارۂ کار نہیں رہتا تو وہ کسی مطالبہ کو مان کر دستور سازی کا ایک قدم اور آگے بڑھاتی ہے، لیکن چونکہ وہ ہر قدم اپنے ایمان کے تقاضے سے نہیں، عوامی مطالبے کے دباؤ سے آگے بڑھاتی ہے اس لیے مطالبہ مان لینے کے بعد پھر فراری ذہنیت سے کام لے کر ایسے چور دروازے رکھنے کی کوشش کرتی ہے جو اسلام سے انحراف کرنے کے لیے "بوقتِ ضرورت" کام دیں۔

ایسے حالات میں جماعت اسلامی کی رہنمائی میں عوام جو دستوری جدوجہد کر رہے ہیں وہ تاریخ میں ایک انوکھے تجربے کی حیثیت رکھتی ہے یعنی اختیارات نمائندگی جن لوگوں کے قابو میں آگئے ہیں وہ سیکولرازم کی صہبا کے سرمست ہیں اور ان کے سینوں میں مصطفیٰ کمال بننے کے ارمان برابر چٹکیاں لیتے رہتے ہیں، لیکن "رائے عام" اُن کے عزائم کا ساتھ دینے پر ایک سیکنڈ کے لیے بھی کبھی تیار نہیں ہوئی۔ دوسری طرف جماعت اسلامی ہے جو اگرچہ قوم کے مناصب نمائندگی اور اختیارات کی طاقت سے محروم ہے لیکن جس نظریہ و نظام کو وہ پیش کر رہی ہے، رائے عام اس کے ساتھ پوری طرح ہم آہنگ ہے۔ گویا حکمراں طاقت کا رُخ مغرب کی طرف ہے تو رائے عام کا رُخ مشرق کی طرف! دونوں میں کشمکش ناگزیر ہے۔ ایسے حالات میں ہونا یہ چاہیے تھا کہ حکمراں اور نمائندہ طاقت یا تو دلائل کے زور سے رائے عام کو مطمئن کرے جاتی، یا پھر عوام کے مطالبے کی معقولیت کو مانتی اور ان کے پسندیدہ نظریہ و نظام کی حقانیت پر صدق دل سے ایمان لاکر اپنی روش کو بدل لیتی۔ ۰۰ ورنہ تیسری راہ پھر صرف یہ رہ جاتی ہے کہ اکثریت سے بنیادی اختلافات رکھنے کی وجہ سے مستعفی ہو جاتی۔ افسوس ہے کہ دنیا بھر کی اس مسلّمہ جمہوری روایت کو بالکل ترک کر دیا گیا ہے۔ اب ہو یہ رہا ہے کہ رائے عام کی طاقت سے جماعت اسلامی دباؤ ڈالتی جاتی ہے اور حکمراں اور نمائندہ طاقت چار و ناچار دستور سازی کے راستے پر ایک ایک قدم اسلام کی طرف اٹھاتی جاتی ہے۔

اس سیاسی "آنکھ مچولی" کے ذریعے گذشتہ سال کے عرصے میں جو کام ہوا ہے اس کے نتائج کا ہم جائزہ لیتے ہیں تو وہ بہت ہی حوصلہ افزا نظر آتے ہیں۔ دستوری رپورٹ کا جو حصہ پاس ہو چکا ہے وہ بہ حیثیت مجموعی اس بات پر گواہ ہے کہ اس ملک میں اسلام کو چاہنے والے عناصر نے لادینیت کو پسند کرنے والے عناصر کے مقابلے میں بڑی نمایاں فتح پائی ہے۔ اور یہ نمایاں فتح خالص دستوری اور آئینی جدوجہد کے ذریعے حاصل ہوئی ہے، درآنحالیکہ ہمارے ملک میں جمہوری قدریں بُری طرح پامال ہوتی رہی ہیں اور شہری آزادیوں کا گلا بالکل گھونٹ دیا گیا ہے! اس مملکت میں اب گویا اسلامی نظامِ زندگی کی نیو پڑ گئی ہے۔

اس کامیابی کا سہرا تنہا جماعت اسلامی کے سر نہیں، بلکہ اس مہم میں جن مختلف تنظیموں اور مختلف افراد نے عوام کی تمناؤں اور جذبوں کا ساتھ دیا ہے وہ سب اس کامیابی کے کریڈٹ میں حصہ دار ہیں۔ اور اس کامیابی کا اصل کریڈٹ وہ ہے جو کسی کو اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں حاصل ہو۔

دستوری رپورٹ کے پاس شدہ حصے کے وہ قابل قدر خدوخال جن کے ذریعے اسلامی تقاضے پورے ہوتے ہیں حسب ذیل ہیں:-

(۱) "قرار داد مقاصد" کو خاتمۂ دستور کی حیثیت میں دفعۂ اوّل بنایا گیا ہے۔ یہ دفعہ گویا ریاست پاکستان کے نظریۂ زندگی (IDEOLOGY) کی ترجمان ہے اور سارا دستور اسی کی روشنی میں دیکھا جائے گا۔ ایک اصولی و نظریاتی ریاست کے لیے یہ ضروری ہوتا ہے کہ اس کا بنیادی اصول و نظریہ واضح اور متعین شکل میں اس کے پیش نظر ہے اور اس کے کارکنوں اور شہریوں کے لیے مشعل ہدایت بنے۔

(۲) دفعہ ۲ میں ریاست کی پالیسی کے لیے جو اصول ہدایت (DIRECTIVE PRINCIPALS) قرار دیے گئے ہیں وہ قرار دادِ مقاصد کے پیش کردہ نظریۂ اساسی ہی کی صراحت ہیں اور ان اصولِ ہدایت میں اسلام کے نمایاں تقاضوں کو جذب کر لیا گیا ہے۔ بلاشبہ اصولِ ہدایت کی بنا پر عدالت میں حکومت کے کسی اقدام کو چیلنج نہیں کیا جا سکتا، لیکن اتنا بہر حال واضح ہے کہ حکومت عوام کے سامنے اس بات کی پابند ہو جاتی ہے کہ وہ اپنے ہر اقدام اور ہر پالیسی کو ان اصولِ ہدایت پر استوار کرے اور عوام کے سامنے اِن اصولِ ہدایت کی بنیاد ہی پر جواب دہ ہو، علاوہ بریں دستور کا کوئی جز بھی اگر عدالت میں زیر بحث آئے تو اس کی تعبیر کرتے ہوئے اِن اصولِ ہدایت کی روشنی مدد دے سکتی ہے۔ ان اصولِ ہدایت میں جو کچھ طے پایا ہے یہ ہے:-

—— یہ بات طے کر دی گئی کہ ریاست کی ہر پالیسی اور ہر سرگرمی قرار دادِ مقاصد کے بیان کردہ اصولوں کے تابع رکھی جائے گی یعنی ہمارے ملک کے اکابر، وزراء، نمائندے اور عہدہ دار ہر فیصلہ یا اقدام کرتے ہوئے ازروئے دستور اس کے پابند ہوں گے کہ خدا کو حاکم (SOVERIGN) مان کر

اس کی شریعت کو اپنے لئے قانون تسلیم کرکے، حکمرانی کے اختیارات کو مقدس امانت مان کر، جمہوریت، آزادی، مساوات، رواداری اور عدلِ اجتماعی کے اسلامی تصورات کو ملحوظ رکھ کر اور اس بات کا خاص خیال رکھتے ہوئے کہ مسلمانوں کو اسلامی زندگی بسر کرنے کے قابل بنایا جاتا ہے، سوچ بچار کریں اور کسی معاملے میں رائے قائم کریں۔ وہ اپنے فیصلوں اور اقدامات میں اسی اصول ہدایت کی بنیاد پر لوگوں کے سامنے جواب دِہ ہوں گے۔

——— یہ بات بھی طے کر دی گئی ہے کہ عین حکومتی سرگرمیوں کے ذریعے ایسی مختلف تدابیر اختیار کی جائیں گی جن کے ذریعے مسلمان اپنی زندگیاں انفرادی اور اجتماعی طور پر قرآن وسنت کے مطابق ڈھالنے کے قابل ہو جائیں۔ ان تدابیر میں سے بعض کی صراحت خاص طور پر کر دی گئی ہے یعنی (ا) قرآن و سنت کی لازمی تعلیم کا انتظام (ب) شراب خواری، قمار بازی اور زناکاری کی ہر شکل کا سدِباب (ج) ربوٰ کی حرمت (د) عوام میں اسلامی اخلاق کا فروغ، اور (س) زکوٰۃ، اوقاف اور مساجد کی معقول تنظیم؛

اس فیصلے کی رُو سے حکومت ذمہ دار ہو گئی ہے کہ وہ اسلامی زندگی کی تعمیر اور بحالی کے لیے دین کی تعلیم کا بندوبست بھی کرے، دینی اداروں کو منظم بھی کرے، منکرات و فواحش کا خاتمہ بھی کرے اور اسلامی اخلاق کی تربیت کے مختلف وسائل بھی اختیار کرے۔ اس کے لیے یہ جائز نہیں رہا کہ وہ کوئی ایسا قدم اٹھائے یا کسی ایسی سرگرمی کی روادار ہو جس کی وجہ سے مسلمانوں کو کسی بھی شعبۂ زندگی میں اسلام سے انحراف کرنا پڑے یا اسلام کے کسی مطالبے کو پورا کرنے میں خلل واقع ہوتا ہو۔ اب کسی بھی چیز کو قائم کرنے یا مٹانے میں حکومت اور اس کے اکابر اور اس کے کارکنوں کو عوام کے سامنے یہ ثابت کرنا ہو گا کہ یہ چیز اسلامی زندگی کے لیے ضروری ہے، یا کم از کم اس کے لیے حارج نہیں ہے۔

گویا یہ اصول ہدایت ایک نیا معیارِ خیر و شر فراہم کرتا ہے۔

——— یہ بات بھی طے کر دی گئی ہے کہ موجودہ قوانین کو کتاب وسنّت کے مطابق ڈھالنے کے لیے، اور کتاب وسنّت کے قانونی اوامر و نواہی کو قانون کا جامہ پہنانے کے لیے مناسب عملی اقدامات کیے جائیں گے۔

اس فیصلے کی رُو سے حکومت کو موجودہ غیر اسلامی قوانین کو بدلنے کے لیے باقاعدہ عملی کام کرنا ہوگا اور اس عملی کام کی نوعیت اور رفتار کا محاسبہ عوام کریں گے کہ یہ ٹھیک اور مناسب طریقے سے ہو رہا ہے یا نہیں !

——— یہ بات بھی طے کر دی گئی ہے کہ جو لوگ کسی عارضی یا مستقل وجہ سے معاشی طور پر معذور ہو جائیں ان کے لیے بلا امتیاز مذہب و نسل ، بنیادی ضروریات ——— غذا ، لباس ، مکان ، تعلیم اور معالجے ——— کی کفالت کا اہتمام حکومت کرے گی ۔

گویا اب نئے دستور کے نفاذ سے اس مملکت میں اسلامی معاشرہ کی وہ فضا پیدا کی جائے گی جس میں ہر فرد جو معذور ہو گیا ہو اس کا یہ حق حکومت پر عاید ہو گا کہ اسے سہارا بہم پہنچایا جائے جو حکومت یہ حق ادا نہ کر سکے گی وہ عوام کا اعتماد کھو دے گی ۔

——— یہ بات بھی طے کر دی گئی ہے کہ ریاست کی اقتصادی پالیسی اس طرح مرتب کی جائیگی کہ مذہب ، نسل اور رنگ کے امتیاز کے بغیر تمام لوگوں کے لیے عام خوش حالی پیدا ہو اور اس مقصد کے لیے (ا) عام شہری کا معیارِ زندگی بلند کیا جائے گا ، (ب) دولت اور ذرائع پیداوار کو چند افراد کے لیے مرتکز ہو جانے اور عام لوگوں کے محروم رہ جانے کے خطرے کا سدِّ باب کیا جائے گا ، اور (ج) مزدوروں اور مزارعوں کے حقوق کو ناجائز انتفاع سے محفوظ کیا جائے گا ۔

اس میں شک نہیں کہ اس اصولِ ہدایت میں چند ایسی باتیں بیان کی گئی ہیں جو مطلوب ہیں لیکن ان کے لیے کوئی فارمولا مرتب نہیں کیا گیا ، تاہم اس اصول کی بنیاد پر اقتصادی معاملات میں حکومت کے فیصلوں اور اقدامات پر تنقید و محاسبہ کیا جا سکتا ہے اور جہاں کہیں اسلامی تقاضوں سے انحراف اور موجودہ سرمایہ دارانہ نظام کا تتبع پایا جائے وہاں گرفت کی جا سکتی ہے ۔ یہ تو بہر حال عوام دیکھیں گے کہ ان کی حکومت نے خوش حالی کو عام کرنے ، عوام کے معیار کو بلند کرنے ، دولت اور ذرائع پیداوار کو ارتکاز سے روکنے اور مزدوروں اور مزارعوں کے حقوق کو ناجائز انتفاع سے بچانے کے لیے کیا کیا اور کیا نہیں کر رہی ۔

——— یہ بات بھی طے کر دی گئی کہ ملک کو جہالت سے نکالنے کے لیے حکومت سرگرمی دکھائے گی اور ۱۵ سال کے اندر اندر پورے شہریوں کے لیے مفت لازمی تعلیم کا انتظام کر دیگی۔

۱۵ سال کی مدت اگرچہ بہت زیادہ رکھی گئی ہے اور نئے نظریوں پر کام کرنے والی ریاستوں میں تعلیمی سرگرمی کی رفتار اتنی سست کبھی نہیں ہوا کرتی، لیکن اگر مخلص اور محنتی لوگوں کو کام کرنے کا موقع مل جائے تو وہ اس رفتار کو جتنا تیز کرنا چاہیں کر سکتے ہیں۔

——— یہ بات بھی طے کر دی گئی ہے کہ ریاست کی پوری کوشش یہ ہوگی کہ وہ مملکت کے مختلف حصوں کی آبادی کو تعلیم و تربیت کے ذریعے کم سے کم مدت میں تمام قومی سرگرمیوں اور دفاع اور دوسری خدمات میں پورا پورا حصہ ادا کرنے کے قابل بنا دے۔

ایک اصولی اسلامی ریاست اس کے بغیر ٹھیک طور پر کام کر ہی نہیں سکتی کہ ہر ہر شہری معاملات کا شعور رکھتا ہو، اجتماعی سرگرمیوں میں دلچسپی لے، مملکت کے دفاع کے لیے ہمہ وقت تیار ہو اور ریاست کی اہم خدمات بجالانے کی قابلیت پیدا کرے۔ آج بعض صوبوں کے لوگ جس طرح پسماندہ ہیں، یہ حالت برقرار نہیں رکھی جا سکتی۔

——— یہ بات بھی طے کر دی گئی ہے کہ ریاست علاقائی، نسلی اور لسانی اور دوسرے غیر اسلامی تعصبات کو دبائے گی اور مسلمانانِ پاکستان کے اندر ملت کے وحدت و استحکام، اس کے نظریۂ اساسی کے مقتضیات اور اس کے نصب العین کو جس کی خاطر پاکستان حاصل کیا گیا ہے ملحوظ رکھنے کا جذبہ بیدار کرے گی۔

اس اصول کے ذریعے لازم ٹھہرا، کہ حکومت اس نظریۂ اساسی اور اس نصب العین کو دلوں میں راسخ کرنے کی تدابیر اختیار کرے اور یہ احساس تازہ رکھے کہ پاکستان کا عین وجود اسی نظریہ و نصب العین پر استوار ہے۔

——— یہ بات بھی طے کر دی گئی ہے کہ صرف ایسے فرد کو صدرِ ریاست مقرر کیا جائیگا جو رائے دہندگان کی نگاہ میں قابلیت، اعلیٰ سیرت، دیانت و امانت اور صالحیت کے اوصاف سے

آراستہ ہو اور جو اپنے فرائض اور ذمہ داریاں قرار دادِ مقاصد کے عین مطابق سر انجام دینے کا اہل ہو۔

یہ اصولِ ہدایت باشندگان ریاست کو رہنمائی دیتا ہے کہ وہ صدرِ ریاست کو انتخاب کرتے ہوئے اسلامی معیارِ انتخاب کو سامنے رکھیں۔ اس اصول سے ضمناً خود بخود عام انتخابات کے لیے بھی رہنمائی ملتی ہے کہ اب پاکستان کی ریاست کو اسلامی خطوط پر چلانے کے لیے کیسے آدمیوں کی ضرورت ہوگی۔

——— یہ بات بھی طے کر دی گئی ہے کہ ریاست کی کوشش یہ ہوگی کہ عدلیہ کو تین سال کے اندر اندر انتظامیہ سے پوری طرح الگ کر دیا جائے۔

اسلامی نظام چونکہ "قانون کے راج" (RULE OF LAW) کے اصول پر چلتا ہے اس لیے اس نظام کا بنیادی تقاضا یہ ہے کہ عدلیہ انتظامیہ کی مداخلت سے پوری طرح آزاد ہو۔ حکومت اس تقاضے کو مدتِ متعین میں پورا کرنے کی ذمہ دار ہوگی۔

——— یہ بات بھی طے کر دی گئی ہے کہ ریاست غیر مسلم فرقوں کے واجبی حقوق اور مفادات کا تحفظ کرے گی۔

کتاب و سنّت کے دستوری قانون کی رُو سے غیر مسلموں کو جان، مال اور آبرو کے تحفظ، اپنے پرسنل لاء کے مطابق فیصلے حاصل کرنے، اور اپنے مذہب پر عمل پیرا ہونے کے جو مستقل حقوق حاصل ہیں ان کے لیے پورا پورا تحفظ بہم پہنچائے بغیر کوئی نظام صحیح معنوں میں اسلامی نظام نہیں ہو سکتا۔ پس یہ رہنما اصول بڑی اہمیت رکھتا ہے اور اگر حکومت کے ہاتھوں غیر مسلموں کا کوئی حق پاکستان میں پامال ہوگا تو اسی اصل کی بنا پر خود مسلم اکثریت ان سے جواب طلب کرے گی۔

——— یہ بات بھی طے کر دی گئی ہے کہ سرکاری و غیر سرکاری ملازمین اور اجیروں کو لازمی سوشل انشورنس اور دوسری ضروری تدابیر سے اجتماعی تحفظ فراہم کیا جائے گا۔

——— یہ بات بھی طے کر دی گئی ہے کہ ریاست شہریوں کے کام کرنے کے حق، زندگی بسر کرنے کے مناسب ذرائع کے حصول کے حق اور آرام اور تفریح کے حق کا تحفظ کرے گی۔ وہ محنت کاروں کے لیے انسانی معیار کے موزوں حالات اور زچگی کے لیے ضروری رعایات کو قانون سازی کے ذریعے

بحال کرے گی۔

—————— یہ بات بھی طے کر دی گئی ہے کہ مختلف درجوں کے ملازمین کی تنخواہوں کے معیار پر نظرثانی کر کے بڑی سے بڑی اور چھوٹی سے چھوٹی تنخواہوں کے تفاوت کا تناسب کم سے کم حد تک گھٹا دیا جائیگا۔

یہ بھی ضروری اصلاحات اور تحفظات ہیں، اور ان کے بارے میں بھی عوام حکومت سے عملی اقدامات کا تقاضا بھی کریں گے اور جو جو قدم اٹھایا جائے گا اس کا محاسبہ بھی کریں گے۔

یہ رہنما اصول ہمارے پورے دستور کی روح رواں ہونگے اور حکومت کے فیصلے، اقدامات اور منصوبے ان کی روشنی میں عمل میں آئیں گے۔ یہ محض اس وجہ سے ایک شئے بیکار نہیں بن جاتے کہ ان کی وسعت مفہوم کو نفاذی دفعات (OPERATIVE CLAUSES) میں نہیں ڈھالا جا سکتا۔

---

(۳) دفعہ ۳ میں صاف صاف طریق سے قبول کر لیا گیا ہے کہ:۔

"کوئی مجلسِ قانون ساز ایسا کوئی قانون پاس نہ کرے گی جو قرآن وسنت کے خلاف پڑتا ہو"

لیکن اگر ایسا کوئی قانون پاس کر دیا جس کا کوئی جزء قرآن وسنت سے ٹکراتا ہو تو دفعہ ۴ سپریم کورٹ کو یہ اختیار دیتی ہے کہ وہ کسی قانون کے بارے میں یہ فیصلہ دے کہ وہ قرآن وسنت کے خلاف ہے یا نہیں؟

اور سپریم کورٹ میں کسی قانون کو زیر بحث لانے کے لیے دفعہ ۵ کے ذریعے ہر شہری کو یہ عام حق دیا گیا ہے کہ وہ کسی قانون کی صحت کو کتاب وسنت کے خلاف پڑنے کی بنیاد پر چیلنج کر سکتا ہے۔

دفعہ ۶ کے تحت اِس خاص بنیاد پر قانون کو چیلنج کرنے کی میعاد قانون کی منظوری کے تین ماہ بعد تک وسیع رکھی گئی ہے۔

دفعہ ۷ میں قرار دیا گیا ہے کہ کم سے کم پانچ ججوں پر مشتمل فل بنچ ایسے معاملات میں سماعت کرے گا اور ججوں کی اکثریت کا فیصلہ فیصلہ ہو گا۔

دستور کے نفاذی حصے میں یہ پورا باب نہایت اہم ہے۔ اس باب میں یہ اصول تسلیم کر لیا گیا ہے کہ قانون سازی بہرحال کتاب وسنت کے حدود میں ہو سکتی ہے۔ ان حدود کو توڑا جائے تو ہر شہری کو حق دیا گیا ہے کہ وہ سپریم کورٹ کے ذریعے گرفت کر سکے۔ اور اگر کسی قانون سازی کا کتاب وسنت کے خلاف ہونا ثابت ہو جائے تو سپریم کورٹ کا فیصلہ اسے کالعدم کر دے گا۔
اس سلسلے میں جو چور دروازہ رکھا گیا ہے اس پر ہم آگے گفتگو کریں گے، یہاں ہم یہ بتانا چاہتے ہیں کہ اصولاً قانون کے لیے کتاب وسنت کا معیار تسلیم کر لیا جانا ایک نمایاں کامیابی ہے۔

---

(۴) دفعہ ۸ کی رُو سے حکومت ایک ایسا ادارہ وجود میں لائے گی جو "امر بالمعروف" اور "نہی عن المنکر" کا فریضہ ادا کرے، اور مسلمانوں کو اسلامی تعلیمات سے آراستہ کرے۔
اس دفعہ کے ذریعے درحقیقت قراردادِ مقاصد اور رہنما اصولوں میں شامل شدہ ایک اہم تقاضے کو نفاذی حیثیت دی گئی ہے۔ اس طرح کے ادارے کے ذریعے حکومت عوام کو اسلام کی جن تعلیمات وہدایات کی تلقین کرے گی، اگر خود حکومت کے نظم ونسق اور اس کے کارکنوں کی زندگیوں میں ان کی خلاف ورزی پائی جائے گی تو یہ تضاد ایسا نہ ہو گا جسے قائم رکھ کر عوام کا اعتماد حاصل کیا جا سکے۔ اس طرح اس ادارے سے دوگونہ فوائد حاصل ہوں گے، ایک یہ کہ عوام خود اسلام کو جانیں اور اصلاح پذیر ہوں، دوسرے حکومت اور اس کے کارکنوں کو اسی ادارے کی دی ہوئی تعلیمات کے معیار پر پرکھیں۔
(۵) دفعہ ۹ کے ذریعے مملکتِ پاکستان کو "جمہوریۂ اسلامیۂ پاکستان" کے نام سے موسوم کیا گیا ہے۔
بظاہر یہ تسمیہ ایک معمولی چیز نظر آتی ہے، لیکن درحقیقت اس کی معنویت بڑا اہم ذہنی اثر رکھتی ہے۔ یہ نام پاکستان کے نظامِ زندگی کی امتیازی نوعیت کا ترجمان ہے۔ یہ نام بول بول کر کہہ رہا ہے کہ پاکستان کا وجود ایک اسلامی نظامِ سیاست وتمدن برپا کرنے کے لیے وقف ہے اور اس میں جمہوریت کو ان اصولوں پر استوار کیا جائے گا جو اسلام نے دیئے ہیں۔ یہاں خدا کی حاکمیت

کے تحت امانتی اقتدار کو تمام باشندگانِ ملک کے مشورے سے استعمال کیا جائے گا۔ دستورِ نو کے نفاذ کے بعد اگر حکومت کی روش کہیں بھی اسلامی جمہوریت سے انحراف کرے گی تو خود یہ نام پکار اُٹھے گا کہ یہ تضاد قابل برداشت نہیں ہے۔

(۵) دفعہ ۳۲ لازم قرار دیتی ہے کہ صدر ریاست کے عہدے کے لیے کسی مسلم ہی کو منتخب کیا جا سکتا ہے۔

اس فیصلے میں ہماری آئیڈیالوجی کارفرما ہے، یعنی ایک اصولی و نظریاتی ریاست کی سربراہ کاری بہر حال کسی ایسے ہی شہری کو سونپی جا سکتی ہے جو اس کے اصول و نظریہ پر ایمان رکھتا ہو۔

(۶) مختلف دفعات کے تحت صدرِ ریاست، واحدہ جات کے مسلم صدروں، تمام مسلم وزراء اور مرکزی اور صوبائی ایوانوں کے تمام مسلم ارکان کے لیے جو حلف تجویز کیا گیا ہے وہ ان پر نہ صرف دستور و قانون کی پابندی لازم ٹھہراتا ہے بلکہ یہ تقاضا بھی کرتا ہے کہ وہ ان تمام فرائض اور ذمہ داریوں کو ادا کریں گے جو اسلام کی طرف سے ان پر عاید ہوتی ہیں۔

یہ حلف کسی صدر یا وزیر یا رکنِ ایوان کے انتخاب میں رائے دینے والوں کے جواب میں وہ عہد استوار کرتا ہے جس سے اسلامی تصورِ بیعت کی تکمیل ہو جاتی ہے یعنی جمہورِ مسلمین کے سامنے ان کے عہدہ دار اور نمائندے تمام معاملات میں اسلام کے اوامر و نواہی کے مطابق عمل کرنے کے ذمہ دار اور جواب دہ ہوں گے۔ اُن کی گردن میں اس حلف کا قلادہ ہوگا اور اس قلادہ کی باگ ڈور جمہور کے ہاتھ میں ہوگی۔

(۷) دفعہ ۳۷ کے ذریعے اب تک کے معمول بہ مفسدے کا دروازہ بند کر دیا گیا ہے کہ ایک غیر منتخب شخص وزارتِ عظمٰی پر لا کھڑا کیا جائے اور وہ وزارت کی تشکیل کرے، نیز لازم قرار پایا کہ وزیرِ اعظم اپنی نامزدگی کے بعد دو ماہ کے اندر اندر فیصلہ اعتماد حاصل کرنے کے لئے پارلیمنٹ کا اجلاس طلب کرے۔ گویا اب "پہلے عہدہ، بعد میں انتخاب" کا اشاخانہ مولا نہ چل سکے گا۔

(۸) اسی طرح دفعہ ۳۸ کے ذریعے کسی غیر منتخب شخص کے لیے وزارت یا پارلیمنٹری سکرٹری کے عہدے پر آنے کا بھی سدباب کر دیا گیا ہے۔

(۹) دفعہ ۴۲ کی شق ۲ (ج) میں ایوانِ نمائندگانِ واحدہ جات کے لیے، دفعہ ۸۴ کی شق ۲ (ج) میں ایوانِ وفاقی کے لیے اور دفعہ ۱۰۲ میں ایوانِ واحدہ جات کے لیے کسی شہری کے ناقابلِ انتخاب ہونے میں بہ حیثیت مجرم اس کے سزا یافتہ ہونے کی جو عمومی علت مذکور تھی، اب حسبِ مطالبہ اس میں جرم کے اخلاقی نوعیت رکھنے کی تحدید کردی گئی ہے۔

یعنی جو لوگ کسی سیاسی جرم کی وجہ سے سزا یافتہ ہونگے ان کو یہ دفعہ انتخاب کے لیے نا اہل نہ قرار دے سکے گی۔

(۱۰) دفعہ ۴۵ نے لازم کردیا ہے کہ عمومی یا ضمنی انتخاب جب واجب ہو جائے تو اسے جلد از جلد منعقد کیا جائے گا اور کسی حالت میں وقتِ معین سے چھ ماہ سے زیادہ تاخیر نہ کی جائے گی نیز دفعہ ۵۵ کی شق ۳ میں یہ بھی قرار دیا گیا ہے کہ سال میں کم از کم چھ ماہ تک دونوں ایوان منعقد رہیں گے شق ۲ کی رو سے ان کے ہر دو اجلاس کے درمیان چھ ماہ سے زائد کا وقفہ بھی نہیں ہوگا یہی صورت دفعہ ۱۰۹ میں واحدہ جات کے ایوانوں کے بارے میں قرار پائی ہے۔

ان دفعات نے اس غیر جمہوری معمول کا دروازہ بند کردیا ہے کہ انتخابات کو موخر کرکے یا پارلیمنٹ کے اجلاس کو دیر تک ملتوی رکھ کر چند افراد اپنی حکومت جمائے رکھیں۔

دستوری رپورٹ کے پاس شدہ حصے کے یہ وہ اجزاء ہیں جو عوام کی دستوری جدوجہد کی کامیابی کے شاہد ہیں۔

اب ہم یہ دکھانا چاہتے ہیں کہ اس حصے میں فراری ذہنیت نے اپنا کیا پارٹ ادا کیا ہے۔

اس سلسلے میں اہم ترین مسئلہ کتاب وسنت کی حدود سے مالی معاملات سے تعلق رکھنے والی قانون سازی کے استثنا کا ہے۔

بابِ سوم کی دفعہ ۳ تا ۷، کے ذریعے قانون سازی میں شریعتِ اسلامیہ سے انحراف کا دروازہ بند کرنے کے بعد دفعہ ۸ کے ذریعے ایک ایسا چور دروازہ کھول لیا گیا ہے کہ زندگی کے بڑے

بڑے اہم اور وسیع الاثر مسائل سے تعلق رکھنے والے قوانین کے تقاضے اس سے گزر سکتے ہیں اور سپریم کورٹ ان کو روک نہیں سکتی ۔

افسوس ہے کہ اس معاملے میں نومن ببعض الکتاب وتکفر ببعض کی ایک ایسی افسوسناک مثال پیش کی گئی ہے کہ جس پر دنیا کے ہر گوشے میں مذاق اڑایا گیا ہے ۔ صورت کچھ ایسی ہے جیسے کوئی شخص کہے کہ میں نے اسلام قبول کیا اور ہر معاملے میں خدا و رسول کا حکم سر آنکھوں پر، لیکن میری جیب، میری تجوری، میرے کاروبار، میرے کارخانے اور میری زمینداری کے مسائل میں خدا و رسول کو مداخلت کرنے کا حق نہ ہوگا ۔ وہی بات کہ " نرمی طلبی سخن دریں است "!

دستور سازی کے ابتدائی دور ہی میں یہ عذر سامنے لایا گیا تھا کہ چونکہ مالی معاملات پیچیدہ ہیں اور فنانس اور بنکنگ کا نظام جس طرز پر چل رہا ہے اسے یکایک بدلا نہیں جا سکتا، نیز غیر ملکی مالی روابط کو نئی بنیادوں پر استوار کرنا ایک مشکل کام ہے، لہٰذا اس کے لیے مہلت چاہیے ۔ اس عذر کے جواب میں ہم نے حسب ذیل امور تقریر و تحریر اور گفتگوؤں کے ذریعے بار بار پیش کیے :۔

اوّل یہ کہ جہاں تک بین الاقوامی مالی روابط کا تعلق ہے، اسلام پر عمل پیرا ہونے میں رکاوٹوں کا حائل ہونا ایک اضطراری صورت ہے جب تک ہم اس اضطراری صورت پر قابو نہ پا لیں، چاروناچار گوارا کریں گے لیکن داخلی مالی نظم کو جو ہمارے اپنے بس میں ہے ہم بلا تاخیر اس کو بدلنے کا آغاز کر دیں۔

دوم یہ کہ سود پر چلنے والا بنکنگ سسٹم جو سرمایہ دارانہ نظام فاسد کی ریڑھ کی ہڈی ہے، اسے ادھیڑ کر نئے طرز پر استوار کیا جا سکتا ہے ۔ اور اس کے ساتھ ساتھ پراویڈنٹ فنڈ، انشورنس اور قرضہ جاتی نظام کو نئی شکل دی جا سکتی ہے ۔ اس کے لیے ہم نے اپنے لٹریچر میں بھی اور اپنے خطابات میں بھی ایک نئے بنکنگ سسٹم کا تصور پیش کیا ہے ۔

سوم یہ کہ داخلی مالی نظم کو بدلنے میں فی الواقع کچھ نہ کچھ مدت درکار ہے کہ جس مدت میں ایک تیز رفتار عملی منصوبے کے تحت تبدیلیاں مکمل کی جا سکیں ۔ اس کے لیے ہماری طرف سے چند سال کی مدت پیش کی گئی تھی، اور اس سے کچھ زیادہ بھی گوارا کی جا سکتی تھی ۔

لیکن ان باتوں پر نہ غور و خوض کیا گیا، نہ اس پیچیدگی کے حل کے لیے جدید مالیات اور اسلامی مالیات کے ماہرین کے سر جوڑ کر بیٹھنے اور مختلف عناصر کا تعاون حاصل کرنے کا اہتمام کیا گیا بلکہ ہمارے دستور ساز نمائندے اپنے عذر کا کھونٹا گاڑ کے بیٹھ رہے۔ چنانچہ وہ آج تک بالکل اندھیرے میں ہیں۔ نہ ان کو اسلام کے مالیاتی اصولوں کا علم ہے، نہ ان اصولوں پر ایمان ہے اور نہ ان کے مطابق تبدیلی پیدا کرنے کا ولولہ ہے۔

چنانچہ پہلی دستوری رپورٹ میں مالیاتی مسودہ ہائے قانون کو غیر معین عرصے کے لیے کتاب وسنت سے آزاد کر دیا گیا۔

اس پر پھر برابر توجہ دلائی جاتی رہی کہ مطلوبہ تبدیلی کے لیے مدت معین طے ہونی چاہیے تاکہ اسلام کا قانون مالیاتی مسودہ ہائے قانون کو بھی اپنے تحت لے سکے۔

لیکن نئی دستوری رپورٹ میں پہلے سے بدتر صورت اختیار کی گئی ہے، اور اب :-

۱- مالیاتی مسودہ ہائے قانون کی تعریف اتنی وسیع کر دی گئی ہے کہ بنکنگ، انشورنس، پراویڈنٹ فنڈ، قرضہ جات، اور " دیگر تمام ایسے معاملات " سے تعلق رکھنے والے مسودہ ہائے قانون جو "موجودہ اقتصادی، مالی اور قرضہ جاتی نظام پر اثر انداز ہوتے ہوں" دفعہ ۳ کی رو سے بالاتر رہیں گے۔

۲- ۲۵ سال تک ان مالی مسودہ ہائے قانون کو کتاب وسنت کی حدود میں لانے کے لیے سرے سے کوئی سعی و تدبیر کرنا از روئے دستور طے نہیں ہے۔ ۲۵ سال کے بعد بھی محض ایک کمیشن بٹھانے کا فیصلہ ہوا، اور بس!

اس کے معنی یہ ہوئے کہ ملک کے معاشی اور مالیاتی ڈھانچے پر اثر انداز ہونے والے کسی قانون کو سپریم کورٹ میں مخالفِ کتاب وسنت ہونے کی بنیاد پر کم سے کم ۲۵ سال تک تو بالکل ہی زیر بحث نہیں لایا جا سکتا۔ اور ۲۵ سال کے بعد کتنی مدت میں ایسی تبدیلیاں ہو سکیں گی جو مالیاتی مسودہ ہائے قانون کو کتاب وسنت کے تحت لے آئیں ان کے بارے میں یہ دستور کوئی ضمانت نہیں دیتا۔

مالیاتی مسودہ ہائے قانون کی جو تعریف کی گئی ہے اس کی حدود اتنی وسیع ہیں کہ جاگیرداری، زمینداری، مداخلت، ٹیکس، تنخواہوں اور معاوضوں کے نظام، محنت کاروں کے معاوضوں کے مسائل وغیرہ میں سے کوئی بھی ان حدود سے باہر نہیں رہتا یعنی اسلام مجوزہ اسلامی دستور کے تحت اس ملک کی معاشی اصلاح کے لیے کوئی مداخلت کرنے کا دستوری حق نہیں رکھتا۔ ملک کے حکمراں جب جو کرم جس طرح کرنا چاہیں کرتے رہیں، خدا کی کتاب اور اس کے رسولؐ کی ہدایات دم بخود کھڑی دیکھتی رہیں گی۔ نتیجہ یہ ہوگا کہ موجودہ مالیاتی اور معاشی نظام کے تمام مفاسد و مظالم اسلامی دستور اور اسلامی نظام کی "برکات" میں شمار ہونگے۔ اور ایک سرمایہ دارانہ و جاگیردارانہ نظام اسلامی دستور کی عین سرپرستی میں سالہا سال چلتا رہے گا۔ اس کا نتیجہ بجز اس کے کیا ہو سکتا ہے کہ خود اسلام بدنام ہو اور ملک کے عوام معاشی زندگی کے مسائل کے حل کے لیے اپنے آپ کو آہستہ آہستہ کمیونزم کے نظامِ فکر و عمل کی گود میں جا ڈالیں۔

یہ کھلا کھلا فرار جمہور کے لیے قابلِ برداشت نہیں ہے!

ہمارے دستور ساز بزرگوں اور ہمارے ملک کی حکمراں پارٹی کے اکابر میں اگر فی الواقع اخلاص کارفرما ہے تو صحیح راہِ عمل یہ ہے کہ وہ نفاذِ دستور کے ساتھ ہی ساتھ ایک خاص کمیشن (مع ایک ریسرچ انسٹی ٹیوٹ) بٹھانے کا فیصلہ کریں جو ایک مدتِ معین میں مالیاتی نظام کی تبدیلی کا پانچ سالہ یا دہ سالہ عملی منصوبہ پارلیمنٹ کے سامنے پیش کرنے پر مامور ہو اور پارلیمنٹ بحث کے بعد اسے منظور کر کے پانچ پانچ سال کے ایک یا دو یا تین منصوبوں کے تحت مطلوبہ تبدیلی کو کسی مدتِ معین میں پورا کرنے کا فیصلہ کرے۔

اس موقعہ پر ہم ایک بار پھر ان حضرات کو یقین دلانا چاہتے ہیں کہ موجودہ معاشی اور مالیاتی ڈھانچہ ایک ایسی اٹل اور ناگزیر مصیبت نہیں ہے کہ جس میں کوئی تبدیلی پیدا کرنا ناممکن التصور یا مہلک ہو اور نہ یہ کوئی ایسی مقدس حقیقت ہے کہ اس کی طرف انگلی اٹھاتے ہوئے آدمی کے اعصاب لرز جائیں۔ دنیا کے کچھ انسانوں نے اپنی ضروریات، اپنے حالات اور اپنے نظریات کے تحت اسے برپا کر کے (باقی صـ پر)

انسانیت کی تعمیرِ نو اور اسلام

عبدالحمید

(۴)

افزائشِ دولت کے اس بحرانی دور میں جب چند نفع اندوزوں نے حکومت اور سرمایہ کے نشے میں غریب اور مفلس انسانوں پر ظلم و ستم کے پہاڑ توڑے تو اس جور و جفا کے خلاف ہر طرف سے صدائے احتجاج بلند ہونے لگی، صورتِ حالات کو بدلنے کی مختلف تجاویز سوچی گئیں۔ ان میں سے ایک یہ بھی تھی کہ جب تک سرمایہ اور حکومت کے ان اجارہ داروں سے وہ قوت نہ چھین لی جائے جس کے بل بوتے پر یہ مفلوک الحال انسانوں پر دستِ ظلم دراز کرتے ہیں، نظامِ دنیوی میں امن و امان قائم نہیں ہو سکتا۔ چنانچہ ان داعیوں نے اپنی جد و جہد کا مقصد یہ قرار دیا کہ کسی طرح سرمایہ کو شخصی تصرف سے نکال کر اُسے حکومت کی تحویل میں دے دیا جائے۔

وہ شخص جس نے انسانی افکار کے ارتقا کا ایک سرسری سا جائزہ بھی لیا ہے وہ اس حقیقت سے اچھی طرح آگاہ ہے کہ یہ تدبیر کوئی بالکل انوکھی نہیں۔ تاریخ انسانی کے ہر دور میں کچھ انسان ضرور ایسے پیدا ہوتے رہے ہیں جنہوں نے اسی طرز پر سوچا اور زیر دستوں پر زبردستوں کی چیرہ دستیوں کو روکنے کے لیے یہ طریقہ کارآمد سمجھا چنانچہ فلاسفہ کے ابوالآباء افلاطون یونانی کی جمہوریہ (REPUBLIC) کا محرک بھی یہی جذبہ تھا۔ وہ اپنی مشہور تصنیف میں اس تصور کو یوں پیش کرتا ہے:۔

"ریاست، حکومت، یا قانون کی بہترین شکل وہی ہے جہاں[1] ہر شخص پوری آزادی سے سماج کی ہر چیز میں شریک ہو سکے"

اس کے بعد مسیحیت کے بڑے بڑے علمبرداروں نے بھی مختلف وقتوں میں اسی خیال کو

[1] PLATU: REPUBIC BOOK V.

پیش کیا۔ مثال کے طور پر امیبورس (AMBROSE) اپنی کتاب پادری کے فرائض (DUTIES OF THE CLERGY.) میں معاشی استحصال (EXPLOITATION.) کی مذمت کرتے ہوئے لکھتا ہے :-

"فطرت نے سارے انسانوں کے لیے اپنی آغوش کھول دی ہے۔ اس لیے سب افراد پوری آزادی کے ساتھ اس سے متمتع ہو سکتے ہیں مگر بُرا ہو حرص کا کہ اس نے اسے چند لوگوں کی میراث بنا دیا ہے[1]"

اسی طرح ایک دوسرا مصنف سی۔ این۔ کوکرین (C.N. COCBRANE) اپنی مشہور تصنیف "مسیحیت اور کلاسیکی تمدن" (CHRISTIANITY AND CLASSICAL CULTURE) میں اسی نظریہ کا یوں اظہار کرتا ہے :-

"خداوند تعالیٰ نے نوع انسانی کو تمام وہ چیزیں عطا کی ہیں جو اس کی اس چند روزہ زندگی میں ضروری ہیں مگر لالچ اور خود غرضی نے لوگوں کو ذاتی ملکیت کے دام میں پھنسا دیا ہے۔ یہ کہنا کہ یہ چیز میری ہے دراصل اس دعویٰ کی تمہید ہے کہ اسے صرف میں ہی اپنے فائدہ کے لیے استعمال کر سکتا ہوں۔ اسی تصوّر نے انسانی شخصیت کو مسخ اور خاندانوں کو برباد کیا ہے[2]"

یہی نہیں بلکہ ازمنۂ وسطیٰ میں وائی کلف (WYCLIFF) اور اس کے بعد سر تھامس مور (SIR THOMAS MORE) نے امراء کے اس تشدّد کے خلاف خون کے آنسو بہائے اور اس بے انصافی اور ظلم کو دُور کرنے کے لیے مختلف نظریات پیش کیے گئے۔ ہمارے قریب کے دَور میں سین سائمن (ST. SIMON) نے صنعتی انقلاب کی تباہ کاریوں کو ختم کرنے کے لیے اس بات پر زور دیا کہ دولت کی پیداوار کے تمام ذرائع حکومت کے قبضہ میں دے دیے جائیں۔ اسی طرح اٹھارہویں صدی کے اواخر میں فوراییر (FOURIER) نے انسانوں کی ایک عظیم اکثریت

---

[1] AMBROSE : DUTIES OF THE CLERGY.

[2] C.N. COCBRANE : CHRISTIANITY AND CLASSICAL CULTURE. P. 400-93.

کی اقتصادی بدحالی اور مزدوروں اور سرمایہ داروں کے باہمی مقابلہ و پیکار سے متاثر ہو کر امداد باہمی کا اصول وضع کیا اور یہ تجویز پیش کی کہ چار پانچ سو خاندانوں کی بستیاں قائم کی جائیں، جو معاشی اور سیاسی اعتبار سے بالکل خود مختار ہوں۔ اُس کا خیال تھا کہ اصلاح حال کی یہی صورت مفید ہو سکتی ہے۔ "مصلحین" کی اسی جماعت کا ایک گل سرسبد (ROBERT OWEN) اوین بھی تھا۔ یہ شخص اگرچہ خود سرمایہ داروں کے طبقہ سے تعلق رکھتا تھا لیکن اُسے مزدوروں کے ساتھ بڑی ہمدردی تھی اور اس نے چند اور سرمایہ داروں کے ساتھ مل کر گلاسکو شہر کے قریب نیو لینارک (NEW LANARK) کی بستی میں ایک کارخانہ خریدا اور اس میں مزدوروں کی حالت درست کرنے کا کام شروع کیا۔ اس نے تمام مزدوروں کو ایک جگہ آباد کیا۔ اتحادی دکانیں کھولیں جن میں وہ اپنی ضروریات کے لیے سامان خرید سکتے تھے۔ اس نے مزدوروں کی تعلیم کا بھی انتظام کیا اور اُن کے کام کے اوقات کو دوسرے کارخانوں کے مقابلہ میں بہت کم کر دیا۔ مزدوروں کی بہتری کے لیے یہ تجربہ نہایت کامیاب ثابت ہوا مگر اس کو پھیلایا نہ جا سکا۔ اس طرزِ خیال کا ایک اور "مصلح" لوئی بلانس (LOUIS BLANCE) فرانس کا ایک انقلابی تھا۔ اس کا نظریہ تھا کہ مزدوروں کے لیے کام فراہم کرنا حکومت کے فرائض میں داخل ہے لہٰذا ریاست کو چاہیے کہ وہ اپنے سرمایہ سے قومی کارخانے کھولے۔ اُن کو کل سامان فراہم کرے۔ دستور بنائے۔ کچھ دنوں تجربے کے بعد یہ کارخانے خود مختار کر دیے جائیں۔

اشتراکیت کے انہی پیشروؤں میں ایک شخص (SANIT AMAND BAZARD) سینٹ اینڈ بیزرڈ ۱۷۹۱ء۔ ۱۸۳۲ء) بھی ہے۔ اگر اشتراکیت کو صرف قومی ملکیت کے ہم معنی سمجھا جائے تو ہم یہ بات بلاخوفِ تردید کہہ سکتے ہیں کہ اس کا فکر مارکس کے مقابلہ میں زیادہ سلجھا ہوا تھا۔ اس شخص نے طبقاتی کشمکش کا تصور پیش کیا اور اس کے بعد بتایا کہ دنیا کا دولتمند طبقہ کس طرح غریبوں کو لوٹ رہا ہے اور سب سے آخر میں پورے زور کے ساتھ قومی ملکیت کی حمایت کی۔

ان لاتعداد افراد کی شب و روز کی مخلصانہ کوششوں کو دیکھ کر ذہن انسانی میں فوراً یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ آخر کیا وجہ تھی کہ ان لوگوں کی ان تھک محنت اور نیک نیتی کے باوجود ان کی مساعی کسی جامع تحریک کا رنگ اختیار نہ کر سکیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ "مسیحی مصلحین" اور مفکرین معاشیات دونوں حیاتِ انسانی کی اس بڑی حقیقت کو نظر انداز کرتے رہے کہ زندگی ایک ناقابلِ تقسیم وحدت ہے اور اس کو الگ الگ خانوں میں بانٹا نہیں جا سکتا۔ مذہب کے علمبرداروں نے لوگوں کو صرف فکرِ آخرت سے ڈرا کر معاشی استحصال کو ختم کرنے کی کوشش کی۔ اُن کی تعلیم کا دائرۂ اثر صرف کلیسا اور خانقاہ کی چار دیواری تک ہی محدود رہا۔ باقی رہی انسان کی معاشی اور سیاسی زندگی تو وہ اس کے تسلط سے یکسر آزاد رہی۔ دوسرے گروہ نے بھی یہی لغزش کی، وہ غلطی سے یہ سمجھتا رہا کہ معاشیات انسانی زندگی کا ایک ایسا الگ تھلگ شعبہ ہے جس کا دوسروں سے کوئی تعلق اور رابطہ نہیں۔ فلسفۂ تاریخ کا ایک مبتدی بھی اس حقیقت سے اچھی طرح واقف ہے کہ کوئی ہمہ گیر تمدنی تحریک اٹھانے کے لیے جو اپنے اندر انسانی قدروں کو بدلنے کا داعیہ بھی رکھتی ہو، ضروری ہے کہ اُس کے مفکرین حیاتِ انسانی کی ایک ایسی مخصوص توجیہہ پیش کریں جو اُس کے مختلف پہلوؤں کو ایک وحدت بنا دے۔ دینِ مادیت نے اگرچہ اشتراکیت کے آغاز سے بہت پہلے زندگی کے بہت سے شعبوں کو اپنے رنگ میں رنگ لیا تھا مگر اس کے باوجود انسانی افکار و اعمال کی کوئی جامع و مانع مادی تعبیر پیش نہ کی جا سکی۔ اشتراکی فلسفہ نے اس کمی کو پورا کیا۔ اس نقطۂ نظر سے آپ غور کریں تو معلوم ہو گا کہ اشتراکیت "دینِ مادیت" کے خلاف ردِ عمل نہیں بلکہ کسی حد تک اُس کی تکمیل ہے۔ ان دونوں میں بہت حد تک مماثلت پائی جاتی ہے کیونکہ دونوں کو ایک ہی سرچشمہ سے فکری غذا ملتی ہے۔ معاشرت و معاملات، اخلاق و اجتماع، سیاست و آئین، علم و فلسفہ کی بنیادی قدریں، دونوں میں مشترک ہیں۔ ان میں اگر کچھ فرق ہے تو صرف مظاہر کا ہے، نوع کا نہیں۔ اشتراکیت مادیت ہی کی زیادہ موثر، وسیع اور ہمہ گیر تحریک ہے۔ اس نے زندگی کے سارے شعبوں

کو مادہ پرستی کی بنیادوں پر استوار کر کے نہ صرف اُنہیں ہم رنگ بلکہ ہم آہنگ بھی بنا دیا ہے لہٰذا اس کے مطالعہ کے لیے ضروری ہے کہ ہم یہ بات اچھی طرح ذہن نشین کر لیں کہ یہ محض غریبوں اور مفلسوں کے معاشی مسائل کا حل ہی پیش نہیں کرتی بلکہ اس کے ساتھ ساتھ وہ اخلاق، تمدن و تہذیب اور مابعد الطبیعی تخیلات کا ایک مستقل نظام بھی ہے۔ اور اس لحاظ سے کوئی شخص اس پورے نظام کو قبول کیے بغیر محض اشتراکی معاشیات کو اختیار نہیں کر سکتا اور اگر کوئی ایسی ناممکن اور خلافِ عقل بات کا دعویٰ کرتا ہے تو یا وہ بدنیّت ہے یا اُس کا دماغی توازن درست نہیں۔ اس نظامِ حیات میں نہ کبھی ایسا ہُوا ہے اور نہ اس کی توقع کی جا سکتی ہے۔

وہ شخص جس نے کمیونزم کو دورِ جدید میں ایک انقلاب انگیز تحریک کی حیثیت سے شروع کیا وہ رائن لینڈ کا ایک یہودی النسل باشندہ مارکس تھا۔ یہودی ہونے کی وجہ سے مسیحیت سے نفرت اسے اپنے باپ دادا سے ورثہ میں ملی۔ یہی وہ اصل وجہ تھی کہ اس نے شروع ہی سے مذہب سے ہٹ کر نہیں بلکہ مذہب کے مخالف کی حیثیت سے سوچنا شروع کیا۔ ایک خوش حال گھرانے کے چشم و چراغ ہونے کی وجہ سے اسے تعلیم کے نہایت اعلیٰ مواقع میسر آئے اور اس طرح اس کا ابتدائی فکر جرمن یونیورسٹیوں میں پروان چڑھا۔ اس وقت وہاں ہیگل (HEGEL) کا طوطی بول رہا تھا۔ مارکس نے اس کے فلسفہ سے بھرپور استفادہ کیا۔ رسمی تعلیم ختم کرنے کے بعد اس نے فکرِ معاش کے لیے صحافت کے خارزار میدان میں قدم رکھا۔ اس اثنا میں اس نے رائج الوقت نظریات کا بڑی گہری نظر سے مطالعہ کیا۔ معاشیات میں ریکارڈو (RECARDO) اور ایڈم سمتھ (ADAM SMITH) کے افکار سے فائدہ اُٹھایا اور سیاسی تصورات میں والٹیر (VOLTAIRE.) اور روسو (RUSSEAU) سے راہنمائی حاصل کی۔ یہی وجہ ہے کہ اس کی تعلیمات فلسفہ، معاشیات اور سیاسیات کا ایک امتزاج[۱] ہے۔

[۱] اہلِ فکر حضرات کے لیے شاید مارکس کے سارے ماخذ کا ذرا تفصیلی بیان دلچسپی کا باعث ہو

(باقی صفحہ پر)

آئیے اب مارکسی نظام حیات کا قدرے تفصیلی جائزہ لیں :۔

اشتراکیت کے حامی اور اس کے مخالف عام طور پر اپنی بحث کا آغاز تاریخ کی مادی تعبیر سے کرتے ہیں یہی ان کے نزدیک اشتراکی فلسفہ کی جان ہے۔ مگر ہم اس کے متعلق کچھ عرض کرنے سے پیشتر اسی نقطۂ نظر کا کھوج لگانا چاہتے ہیں جو اشتراکیت اس کائنات کے متعلق انسان کو عطا کرتی ہے۔ انسان خواہ کسی خیال کا حامی ہو اس امر پر غور کرنے کے لیے مجبور ہے کہ جس دنیا میں وہ زندگی گذار رہا ہے اس میں اس کی حیثیت کیا ہے ؟ اور اگر اس کو برتنے تو کیا سمجھ کر برتے ؟ یہ سوال ایک ایسا سوال ہے کہ انسانی زندگی کے تمام اعمال پر اس کا نہایت گہرا اثر پڑتا ہے۔ دوسرے انسان یہ بات سوچتا ہے کہ اس دنیا میں اس کی زندگی کا مقصد کیا ہے۔ یہ ساری تگ و دو، یہ ساری کشمکش، یہ سب محنت و مشقت آخر کس لیے ہے یہی مقصود و مطلوب کا سوال انسان کی عملی زندگی کا رُخ اور اس کی رفتار متعین کرتا ہے اور اُسی کے مطابق عمل کے طریقے اور کامیابی کے وسائل اختیار کیے جاتے ہیں۔

یہ وہ اوّلین اور بنیادی سوالات ہیں جن کو کوئی ایسا نظام ایک لمحہ کے لیے نظر انداز نہیں کر سکتا جس کا تعلق زندگی کی گہرائیوں سے ہو، جس کی جڑیں انسان کے قلب و دماغ

(بقیہ حاشیہ صفحہ) اجتماعی ملکیت کا تصور اس نے میبلی (MABLY) اور بیزاڈ (BAZARD) سے لیا۔ تاریخ کی مادی تعبیر پر ایک صدی پیشتر ہال باش (HOL BOCH) تفصیل سے بحث کر چکا تھا اور یہ شخص سپنوزا (SPINOZA) سے متاثر تھا۔ مارکس کے اپنے عہد میں فیور باش (FEVER B) اسی خیال کو نہایت سلجھے ہوئے انداز میں پیش کر چکا تھا۔ طبقاتی نزاع کا تذکرہ سین سائمن (ST. SIMON) تھیری (THIERRY) اور مگ نٹ (MIGNET) کی کتابوں میں بکثرت ملتا ہے۔ مزدوروں کی ڈکٹیٹرشپ کا نعرہ اٹھارہویں صدی کے آخر میں بابوف (BABEUF) نے بلند کیا۔ اسی طرح سماج میں معاشی استحصال اور اس کو دور کرنے کی یہ تجویز کہ تمام ذرائع پیداوار کو حکومت کے ہاتھوں میں دے دیا جائے، مارکس سے پہلے فوریر (FOURIER) برے (BRAY) اور تھامپسن (THOMPSON) پیش کر چکے تھے۔

میں پیوست ہوں اور جس کی شاخیں انسانی زندگی کی وسعتوں میں پھیلی ہوئی ہوں۔ ان سوالات کا متعین جواب دیئے بغیر نہ ہم زندگی کا کوئی حقیقی مسئلہ طے کر سکتے ہیں ؛ نہ نظام حیات کا کوئی نقشہ بنا سکتے ہیں۔ کوئی نظام زندگی خواہ کتنا سطحی اور مادّی ہو ان سوالات کے جواب کا کوئی نہ کوئی رُخ ضرور رکھتا ہے۔

مارکسی فکر کی اساس یہ ہے کہ اس کائنات کی اصل حقیقت مادہ ہے، جو جواہر کے مجموعہ سے عبارت ہے جن کی تشریح طبیعیات کے اصول موضوعہ کے ذریعہ ہی کی جاسکتی ہے۔ عالم میں جو کچھ بھی موجود ہے وہ ان قوانین کا پابند ہے۔ اس طرز خیال کے حامیوں کے نزدیک کسی بالاتر ہستی کا وجود یا اُس کی فرمانروائی پر یقین نہ صرف خلاف عقل و فطرت ہے بلکہ انسانیت کے لیے انتہائی خطرناک اور مہلک بھی ہے۔ خدا خود کوئی قائم بالذات ہستی نہیں بلکہ اس کے وجود کا اقرار انسان کی عاجزی اور درماندگی کا اعتراف ہے۔ نوع انسانی جب کائنات کے اسباب واثرات کے وسیع اور پیچیدہ طلسم کو جو غیر محدود زمان ومکان میں پھیلا ہوا ہے سمجھنے سے عاجز آجاتی ہے تو وہ مجبور ہو کر ایک بالاتر ذات کو تسلیم کر لیتی ہے۔ مگر جب انسان طبیعی قوانین کی ان پیچیدگیوں کو حل کرلے گا اور وہ خود کائنات کے اسرار ورموز جان لے گا تو پھر اس کے دل میں خود بخود کسی بلند و بالا ذات کا خوف باقی نہیں رہے گا۔ اس لحاظ سے خدا کا وجود دراصل قوانین طبیعی سے لاعلمی کا نتیجہ ہے۔ چنانچہ لینن نے اپنے ایک خط میں اس خیال کا اظہار کیا ہے۔

> "خدا کا وجود نہایت ہی پیچیدہ خیالات سے عبارت ہے جن کو قوانین طبیعی سے بے خبری نے جنم دیا ہے۔"

وہ فلسفہ جو انسان کو یہ تعلیم دے کہ اس دنیا میں کوئی بالاتر ہستی موجود نہیں وہ قدرتی طور پر ذہن انسانی میں اس خیال کو بھی راسخ کر دیتا ہے کہ اس کی اپنی حیثیت اس کارخانۂ حیات میں ایک عارضی اور اتفاقی شے کی سی ہے۔ جو فطرت کی اندھی قوتوں کی نہ صرف

تخلیق ہے بلکہ اُن کے ہاتھ میں ایک بے بس کھلونا بھی ہے۔ آپ ذرا غور فرمائیں تو دیکھیں گے کہ جب حیاتِ انسانی کی صرف طبیعی قوتوں کے ذریعے توجیہ کی جائے تو اس کی اپنی کوئی مستقل حیثیت باقی نہیں رہتی۔ زندگی کا یہ میکانکی تصور جو اشتراکیت نے انسان کے سامنے پیش کیا ہے اس سے نہ صرف وجودِ باری تعالیٰ کی نفی ہوتی ہے بلکہ خود انسان بھی انسانیت کے شرف سے محروم ہو جاتا ہے۔ وہ فطرت کی کرشمہ سازیوں کا محض ایک بے بس اور غیر متعلق تماشائی بن کر رہ جاتا ہے۔ اس کی ساری خواہشات اور تمنائیں چاہے وہ کچھ ہی کیوں نہ ہوں محض دھوکا ہیں۔ وہ اپنی حماقت سے اپنے آپ کو کائنات کا مرکز تصور کرتا ہے۔ مگر یہ اس کی ابلہ فریبی ہے۔

پھر جب ہم یہ تصور کرتے ہیں کہ اس عالم کی ماہیت زمان و مکان کے علاوہ کچھ بھی نہیں تو ہمیں از خود اس بات کو تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ مادہ کی یہ منظم دنیا صرف توانائی کی لہروں سے تعمیر کی گئی ہے اس لیے اس "عالمِ رنگ و بو" کے پرے کوئی دوسرا عالم نہیں۔ اس استدلال کا منطقی نتیجہ یہ ہے کہ اس زندگی کے بعد کسی دوسری زندگی اور اس عالم کے بعد کسی اور عالم کے وجود کا مطلق انکار کیا جائے۔ جس کو حواس کے علاوہ کسی اور دلیل سے ثابت کیا جاتا ہے یا جن کو ماننے کے لیے محسوسات کے علاوہ کسی اور چیز کا وجود ماننا پڑے۔ اس زندگی کے بعد کسی دوسری زندگی کے وجود کے انکار کا لازمی نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ یہی زندگی منتہائے نظر بن جاتی ہے۔ کسی آئندہ محاسبہ کا ڈر باقی نہیں رہتا۔ طبیعت میں ایک قسم کی آزادی اور بے قیدی سی پیدا ہو جاتی ہے۔

آپ اگر میری پچھلی گزارشات پر ذرا گہری نگاہ ڈالیں تو آپ خود محسوس کریں گے کہ استدلال کا یہ طریق اور مقدمات کی یہ ترتیب کائنات کی میکانکی توجیہ کے عین مطابق ہے۔ اس نظریہ پر غور و فکر کرنے سے پتہ چلتا ہے کہ یہ دوسرے مظاہرِ فطرت کے لیے چاہے کتنا ہی صحیح ہو لیکن ہم مظاہرِ حیات کو اس کی مدد سے پوری طرح کبھی نہیں سمجھ سکتے۔ انسان

اپنی پیدائش سے لے کر موت تک زندگی کی عجیب وغریب حالتوں میں سے گزرتا ہے۔اس کی نشوونما میں جذبات اور عقل دونوں بڑھ چڑھ کر حصہ لیتے ہیں۔ وہ اپنی ذات کو خارجی حقیقت سے زیادہ اہم سمجھتا ہے جو اس کے احساسات کو انفرادیت بخشتی ہے اس کے اعمال کے محرکات اور ان کی نوعیتیں اس قدر پیچیدہ اور الجھی ہوئی ہیں کہ مادہ کی طرح انہیں سادہ اجزا میں تحلیل نہیں کیا جاسکتا۔ آپ خود بخود اندازہ لگا سکتے ہیں کہ جو فلسفہ بے جان، بے حس اور بے ارادہ مادے سے چند اصول وضع کرکے انہیں شعور، ارادہ اور خواہش رکھنے والے انسانوں پر منطبق کرنے کی کوشش کرے وہ حقیقت سے کس قدر بغاوت کرتا ہے۔ انسان جمادات کی طرح مجبورِ محض نہیں اس کو اپنے احوال میں ایک حد تک تصرف کرنے کی قدرت بھی دی گئی ہے۔اب اگر اصحابِ علم کا کوئی گروہ ان دونوں کا ایک ہی حیثیت سے مطالعہ کرے تو یہ علم کے ساتھ بڑی بے انصافی ہوگی۔

پھر اس کائنات کی میکانکی توجیہ کرنے والوں کے اپنے خیالات میں بے حد تضاد پایا جاتا ہے۔ ایک طرف تو وہ مادہ کی اس منظم دُنیا اور اس کے سارے مظاہر کو لا متناہی اور غیر محدود توانائی (انرجی) کی کرشمہ سازی تصوّر کرتے ہیں۔ لیکن دوسری طرف اُنہیں اس باشعور ہستی کے وجود کا بھی انکار ہے جس نے غیر معین توانائی کے بطن سے معین مظاہر پیدا کیے۔ معاملہ صرف یہی نہیں بلکہ اس کے بعد انسان کے ذہن میں بے شمار سوالات پیدا ہوتے ہیں۔ انسان پھر اس طرز پر سوچتا ہے کہ آخر یہ تنوع، کثرت اور تعدد کیا ہیں؟ انسانی زندگی اور ذہن اور اس کے آگے شعور کی دوسری منزلیں جو سلسلۂ ارتقاء میں مضمر ہیں ان کی حیثیت کیا ہے؟۔ اگر قدرت کا یہ سارا کارخانہ، بے مقصد اور بے دلیل ہے تو پھر اس بے منصوبہ عمل سے نظم و ربط کیسے ظاہر ہو گئے۔ وحدت سے کثرت نے کس طرح اور کس پلان کے مطابق جنم لیا۔ ارتقاء کے میکانکی اور اندھے لزوم سے شعور و ذہن کیسے وجود میں آئے۔ آخر کونسا وہ مجوزہ تھا جس نے بے شعوری سے شعور کو ظاہر کرنا تجویز کیا۔ آپ اس مسئلہ پر جس قدر بھی زیادہ غور کریں گے آپ کو یہی معلوم ہوگا کہ خود مادیین اس معاملہ میں بے حد اُلجھے ہوئے ہیں۔ اور وہ شعور رکھنے والی کسی بالاتر ہستی کا انکار کرتے کرتے خود اپنے نظامِ فکر میں

لاتعداد رخنے چھوڑ جاتے ہیں۔ اگر آپ یہ تسلیم کرتے ہیں کہ مادہ میں ایک ربط و تنظیم ہے اور اُس کا ارتقا ایک لگی بندھی تجویز کے مطابق ہو رہا ہے تو آپ کو لامحالہ یہ بھی ماننا ہو گا کہ کسی باشعور ذات نے اس سارے کارخانہ کو پیدا کیا ہے اور اس کو وجود عطا ہونے کے بعد اب اُسی کی تجویز کے مطابق یہ سارا انتظام چل رہا ہے۔ مگر اس کو فکری کجی کے علاوہ اور کیا کہا جا سکتا ہے کہ یہ اصحابِ عقل و دانش نہ صرف ان مقدمات کو تسلیم کرتے ہیں بلکہ انہیں پر اپنے سارے نظامِ فکر کی بنیاد بھی رکھتے ہیں مگر جب انہی مقدمات سے نتائج اُن کے اپنے نظامِ فکر سے قدرے مختلف ہوتے ہیں تو وہ انہیں بلاتکلف جھٹلاتے ہیں۔

مجھے اسوقت اس نظریہ کی فکری لغزشوں پہ کوئی سیر حاصل بحث کرنا مطلوب نہیں بلکہ مجھے جو کچھ بتانا مقصود ہے وہ صرف یہ کہ ان لوگوں نے انسانیت کی ایسی مٹی پلید کی ہے کہ اس کے اظہار کے لیے قلم عاجز ہے۔ ان حضرات نے صرف یہ دیکھ کر کہ انسان کے مادی وجود کا تانا باتا عناصرِ طبیعی کے مجموعہ سے عبارت ہے یہ نتیجہ اخذ کر لیا کہ وہ کسی بلند و بالا ہستی کا خلیفہ نہیں بلکہ حیوانات کی دیگر انواع میں سے ایک نوع ہے اس میں اور دوسرے حیوانات میں بس اتنا فرق ہے کہ یہ تعقل کی زیادہ ترقی یافتہ قوتیں رکھتا ہے۔ مگر جو ترقی یافتہ قوتیں اس کے پاس ہیں ان کا مصرف اس کے سوا کچھ نہیں ہے کہ حیوانی مقاصد ہی کو زیادہ کمال کے ساتھ پورا کرنے میں ان سے کام لیا جائے۔ انسانیت کے یہ محسن انسان پہ یہ "کرم" فرمائی کرتے ہوئے اس حقیقت کو غالباً بھول گئے ہیں کہ خداوند تعالیٰ نے اپنے اس "خلیفۃ الارض" میں عناصرِ طبیعی کی تاریکی کے ساتھ ساتھ ذہن و شعور کی شمع بھی روشن کی ہے جو مادہ سے بالاتر ایک حقیقت ہے۔ اس لحاظ سے اصولِ حیات مادہ سے آزاد اپنا وجود رکھتے ہیں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ مادہ سے جنم لینے کی وجہ سے انسان کی کچھ مادی احتیاجات ہیں جن کو پورا کرنے کے لیے وہ بعض اوقات نہایت نچلی سطح پر اُتر آتا ہے مگر یہ حقیقت بھی اپنی جگہ مسلّم ہے کہ یہی انسان بسا اوقات سیرت و کردار، ایثار اور بے لوثی کے ایسے بلند مقامات پر جا کھڑا ہوتا ہے جو پوری نوعِ انسانی کے لیے سرمایۂ صد افتخار

ہے۔ مگر افسوس کہ اشتراکیت نے انسان کو محض ایک نفع پرست، اغراض کا غلام، جذبات کا بندہ سمجھ کر اس کا مطالعہ کیا۔ وہ اس کی فطرت کے متعلق انتہائی مایوس ہے۔ وہ اس "ترقی یافتہ معاشی حیوان" سے یہ توقع نہیں رکھتی کہ اگر کوئی معاشی قوت اس کی امانت میں سونپی جائے تو وہ دیانتدارثابت ہوگا۔

ان ابتدائی گزارشات کے بعد اب ہم اشتراکی فلسفہ پر ایک نظر ڈالتے ہیں :۔

ایک مفکر کا قول ہے کہ اجتماعی عمل کا ہر نظریہ لازمی طور پر فلسفۂ تاریخ ہوتا ہے۔ وہ لوگ جنہوں نے کبھی بھی زندگی اور اس کے مسائل پر سوچا وہ ہمیشہ تاریخی ارتقاء کی ایسی شاہراہ کی جستجو کرتے رہے جس سے انسان کے قدم کبھی نہ ہٹے ہوں۔ ان کے ذہن کسی ایسے سلسلہ کے متلاشی رہے جنہیں اگرچہ انسانوں نے خود محسوس نہ کیا مگر جو شروع سے آخر تک قائم رہا۔ ارتقاء کی اسی "شاہراہ" کو نشوونما کے اسی سلسلہ کو دریافت کرنے کے لیے مارکس نے بھی دماغ سوزی کی۔ اس نے اس سلسلہ میں ہیگل کی طرح زیادہ تر منطق سے کام لیا اور زندگی کو منطقی مقدمات ونتائج کا ایک پیچ در پیچ سلسلہ تصور کر لیا۔ ہیگلؒ کے نزدیک اصل چیز تصور ہے اور معاشرتی مظاہر اس کے مجسمے۔ اس کے برعکس مارکس کا دعویٰ یہ ہے کہ کسی عہد کا معاشی نظام ہی تاریخ کے ہر دَور میں زندگی کی اصل بنیاد ہے۔ مذہب، تہذیب، فلسفۂ حیات، فنونِ لطیفہ سب اسی معاشی نظام کے رُخِ زیبا کا عکس ہیں۔ یہی نہیں بلکہ تمام انسانی تخیلات وجذبات وتمنیات اسی سے متغیر ہوتے ہیں۔ فکرِ معاش کی تگ وتاز ہی فطرتِ انسانی کی منتشر اور غیر محدود کیفیتوں کی شیرازہ بند ہے۔ الغرض یہی معاشی نظام حیاتِ انسانی کے سارے مشاہدات کا اصل خالق ہے۔ لوگ غلطی سے یہ سمجھتے ہیں کہ وہ پیٹ کے تقاضوں کے علاوہ بھی کچھ تقاضے رکھتے ہیں اور وہ ان کو پورا کرنے کے لیے جدوجہد کر رہے ہیں۔ مگر وہ سب ایک شدید غلط فہمی کا شکار ہیں۔ انسانی زندگی کا اصل محرک صرف شکم ہے۔ مارکس نے اسی طرزِ فکر کو اپنے فلسفۂ تمدن کا سنگِ بنیاد قرار دیا ہے۔ کیونکہ اس کے نزدیک زندگی کی تمام قدروں کی تخلیق وتکوین اسی کے توسط سے

لہ اس موضوع پر ایک سرسری سی بحث ہم اسی مجلہ کی جلد ۴۰ عدد ۴ میں کر چکے ہیں۔

عمل میں آتی ہے۔

نشو و نما کا یہ طریقہ بتلانے میں بھی مارکس نے ہیگل ہی کی رہنمائی حاصل کی ہے۔ ہیگل کا خیال یہ ہے کہ انسان اپنی روحانی اور جسمانی ضروریات کو دیکھتے ہوئے کوئی معاشرتی نظام قائم کرتا ہے جو دراصل روحِ مطلق کا مجسمہ ہوتا ہے۔ جب روحِ مطلق ایک قدم آگے بڑھتی ہے تو اس نظام کے مختلف ہم آہنگ شعبے بے ربط ہو جاتے ہیں۔ لوگ پھر اس نظام کی تردید کرتے ہیں۔ اور اس تردید کا نتیجہ ایک نیا نظام ہوتا ہے جو گذشتہ اور موجودہ تصورات اور نظام کے امتزاج سے پیدا ہوتا ہے مارکس بھی بالکل اسی طرح یہ دعویٰ کرتا ہے کہ ہر زمانے میں صنعتی پیداوار کے طریقے ہی اس عہد کے معاشرتی تعلقات کو متعین کرتے ہیں۔ رفتارِ زمانہ کے ساتھ جب طرقِ پیدائش کی نئی نئی گرہیں کھلتی ہیں تو زندگی کے دوسرے شعبوں میں ترتیب نہیں رہتی اور معاشرتی تعلقات کو ایک نئی شکل دینے کی کوشش کی جاتی ہے۔ یہی وہ کوششیں ہیں جنہیں ہم تاریخ عالم میں انقلابات کے نام سے تعبیر کرتے ہیں۔ چونکہ ایجادات و اکتشافات کا ایک لامتناہی سلسلہ طرقِ پیدائش میں ہر آن تبدیلی پیدا کرتا رہتا ہے۔ اسی لیے انسانیت کو بھی کسی منزل پر سکون اور قرار نصیب نہیں ہوتا۔ جب ایک منزل پر اس کا قافلہ پہنچ جاتا ہے تو پھر پیداوار کے طریقوں میں ایک تغیر رونما ہوتا ہے جو انسانیت کو پھر بے چین کر کے اسے آگے بڑھنے کی طرف دعوت دیتا ہے۔ اسی کی بدولت انسان میں عمل کی خواہش کچھ ہونے کی تمنا اور اپنی قوتوں کو ایک راہ پر ڈالنے کا ارادہ پیدا ہوتا ہے۔ اگر یہ معاشی محرک ہمیں سرگرم عمل نہ کرے تو یہ دنیا ایک قبرستان کا سا نقشہ پیش کرنے لگے۔

اس نظریہ سے نہ صرف انسانی ارتقاء کی شاہراہ معلوم ہوتی ہے بلکہ اس سے اخلاقی اقدار کا ایک نیا تصور بھی سامنے آتا ہے۔ اس کے مطابق دنیا کی ساری صداقتیں اضافی قرار پاتی ہیں یعنی ہر صداقت جس دور کے خارجی حالات سے وجود پذیر ہوتی ہے اسی دور کے ختم ہو جانے پر ساقط الاعتبار ہو جاتی ہے۔ ایسی کوئی صداقت نہیں اور نہ ہو سکتی ہے جو ہر زمانہ کے لیے یکساں طور پر

صحیح ہو اور ابدی ہونے کا دعویٰ کرے، لہٰذا ہر دَور کا اپنا ایک الگ "قرآن" ہے۔ یہ نیک و بد محمود و مذموم یا حق و باطل کی تفریق سراسر فریب ہے۔ ایک چیز جو ایک دَور میں حق ہے وہی دوسرے دور میں باطل ہو سکتی ہے، اسی طرح اگر ایک فعل ایک خاص ماحول میں نیکی تصور کیا جاتا ہے تو ماحول کے تبدیل ہونے کے ساتھ ہی اس کے متعلق ہمارا زاویۂ نگاہ بھی بدل جاتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ تمام انسانی تصورات و تخیلات اور اخلاق و اقدار خارجی احوال و واقعات اور خصوصاً معاشی نظام کا عکس ہوتے ہیں۔

اشتراکیوں کے ہاں جس قدر اہمیت تاریخ کی اس مادی تعبیر کی ہے اس کا ایک ہلکا سا اندازہ اینجلز کی اُس تقریر سے لگایا جا سکتا ہے جو اُس نے مارکس کی موت پر کی۔ وہ کہتا ہے:۔

"جس طرح ڈارون نے فطرت میں قانون ارتقا کو دریافت کیا اسی طرح مارکس نے انسانی تاریخ میں ارتقاء کے قانون کو معلوم کیا۔ اس نے ایک ایسی بدیہی حقیقت کا کھوج لگایا جو امتدادِ زمانہ کی لپیٹ میں آ کر نظری بحثوں میں گم ہو گئی تھی۔

"نسلِ انسانی کو سب سے پہلے کھانے کے لیے خوراک، پینے کے لیے پانی، رہنے کے لیے مکان اور تن ڈھانکنے کے لیے کپڑا میسر آنا چاہیے اس کے بعد ہی وہ سیاست، مذہب، سائنس اور دیگر فنون میں دلچسپی لے سکتا ہے لہٰذا طریقِ پیداوار ہی اصل بنیاد ہے جس پر سماجی زندگی کی عمارت تعمیر کی جاتی ہے یہی وہ اساس ہے جس پر کہ ریاستی ادارے، قانونی تصورات علم و فنون حتیٰ کہ مذہبی معتقدات کے رفیع الشان محلات اٹھائے جاتے ہیں۔"[1]

(ب) تاریخ کی مادی تعبیر کے بعد دوسرا اہم اصول طبقاتی نزاع (CLASS STRUGGLE) ہے۔ مارکس کے نزدیک ہر معاشی نظام جب ترقی کی ایک خاص منزل پر پہنچ جاتا ہے تو اُس کے اندر سے ہی بعض نئی پیداواری قوتیں نمودار ہو کر اپنے زمانہ کے حالاتِ پیداوار سے متصادم ہو جاتی ہیں۔ نئی قوتیں اس بات کا تقاضا کرتی ہیں کہ مروجہ نظام جس طبقاتی تقسیم پر مبنی ہے اُسے بدل کر طبقوں کی تقسیم از سرِ نو عمل میں لائی جائے اور وہ ملکیتی نظام بھی تبدیل کر دیا جائے جو افرادِ معاشرہ کے

[1] MARX, SELECTED WORKS P.16.

ملکیتی تعلقات کو منضبط کرتا ہے۔ یہ مطالبہ اُن طبقوں پر سخت شاق گزرتا ہے جنہوں نے نہایت ہی عیاری سے مروجہ معاشی تنظیم اور طبقاتی تقسیم میں دوسرے طبقوں سے زیادہ قوت اور اقتدار حاصل کر لیا ہے۔ اقتدار کی لذت اور مال کی محبت انہیں اپنے حقوق خواہ کتنے ہی ناجائز ہوں چھوڑنے نہیں دیتی حکومت کی مسندوں پر یہی لوگ براجمان ہوتے ہیں اس لیے وہ اپنے مفادات کی پوری طاقت کے ساتھ حفاظت کر سکتے ہیں۔ اسی طرح ہر معاشرہ میں ناجائز انتفاع کرنے والوں کا ایک طبقہ موجود ہوتا ہے جو دوسروں کے خونِ گرم سے اپنے لیے سامانِ عیش مہیا کرتا ہے۔ اس لیے جب کسی معاشی تنظیم میں نئی پیداواری قوتیں ابھر کر مروجہ طبقاتی تقسیم کی بنیادوں کو متزلزل کر دیتی ہیں تو یہ طبقے ان قوتوں کو مٹانے اور دبانے کے لیے ایڑی چوٹی کا زور لگاتے ہیں کیونکہ ان طبقوں کی فتح اور کامرانی برسرِ اقتدار گروہ کے لیے موت کا پیغام ہوتی ہے۔ دوسری طرف وہ طبقے جنہیں قوتِ لایموت بھی میسر نہیں آتی، جو صرف اس لیے جیتے ہیں کہ اپنے قوائے ذہنی اور جسمانی کو اس مخصوص جماعت کی ضروریات و حوائج کو پورا کرنے میں کھپا دیں وہ جب نئی پیداواری قوتوں کو آتے دیکھتے ہیں تو اُن کا نہایت ہی گرمجوشی سے استقبال کرتے ہیں کیونکہ انہیں ان قوتوں کی کامیابی کے ساتھ ایک بہتر معاشی نظام کی توقع ہوتی ہے۔ اس طرح غالب و مغلوب، ظالم و مظلوم میں ایک مستقل کشمکش جاری رہتی ہے جسے عام طور پر طبقاتی نزاع کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔ مارکس کے نزدیک انسانیت کے تمام اہم فیصلے جو کہ زندگی کو بدلنے والے ہوں وہ اسی کشمکش کا نتیجہ ہیں۔ اس جنگ میں غالب معاشی طبقہ مروجہ معاشی نظام کا حامی اور رائج الوقت ملکیتی نظام کا نمائندہ ہوتا ہے اُس کی کوشش یہ ہوتی ہے کہ وہ اس نظام کو خواہ وہ کتنا ہی فرسودہ اور بیکار ہو جوں کا توں قائم رکھے۔ اس کے برعکس مظلوم طبقے مروجہ معاشی نظام کی سختیوں اور جبرہ دستیوں کی وجہ سے اسے جلد از جلد بدلنے کے متمنی ہوتے ہیں کیونکہ اس کی تبدیلی کے ساتھ ہی اُن کی حالت کچھ بہتر ہو سکتی ہے۔

برسرِ اقتدار طبقہ کچھ دیر تک اپنے اقتدار کے سہارے ان نئی قوتوں کو دبانے میں کامیاب ہوتا ہے مگر جوں جوں وقت گزرتا ہے بغاوت کی یہ آگ اتنی پھیل جاتی ہے کہ پھر اسے قابو میں

رکھنا اس کے لیے ممکن نہیں رہتا۔ ایک شدید کشمکش کے بعد ظالم اس امر پر مجبور کر دیے جاتے ہیں کہ وہ اقتدار کی باگیں ان مظلوموں کو دے دیں۔ پسے ہوئے طبقوں کی اس کامرانی کے ساتھ معاشی نظام بھی بدلنے لگتا ہے اور سماج کی تنظیم بالکل ایک نئی بنیاد پر کی جاتی ہے۔

مارکس کا دعویٰ ہے کہ تاریخ انسانی کے تمام عظیم الشان واقعات و حوادث اور بڑے بڑے سیاسی انقلابات کی تہ میں دراصل یہی طبقاتی نزاع کام کرتی ہے۔ یہ ضروری نہیں کہ ہر تصادم کے وقت دونوں طبقوں کو اس امر کا بھی احساس ہو کہ وہ کسی معاشی غرض کی خاطر آپس میں برسرپیکار ہیں مگر جب پردۂ فریب ہٹا کر دیکھا جائے تو معلوم ہو گا کہ غرض خواہ کچھ ہی ہو، مقصد چاہے کس قدر بلند و بالا ہو، اور اسے خواہ کتنے مقدس ناموں سے پکارا جاتا ہو، مگر دونوں طبقوں کے تحت الشعور میں جو چیز کام کرتی ہے، جو جذبہ انہیں بھڑکاتا ہے وہ یہی شکم اور اس کے تقاضے ہیں۔ چنانچہ مارکس اور انجلز نے اشتمالی منشور کا آغاز اس دعویٰ سے کیا ہے۔

"انسان نے آج تک جتنے معاشرے قائم کیے ہیں ان سب کی تاریخ طبقاتی نزاع کی .... تاریخ ہے۔ غلام اور آقا، امرا اور جمہور، سرمایہ دار اور مزدور مختصر یہ کہ ظالم اور مظلوم ہمیشہ سے ایک دوسرے کے مخالف اور باہم برسرپیکار رہے ہیں"

(ج) مارکسیت کا تیسرا اصول یہ ہے کہ کسی شے کی اصل قدر محنت کی وہ مقدار ہے جو اسے پیدا کرنے میں صرف ہوتی ہے۔ اس نظریہ کی صحت اگرچہ مشکوک ہی ہے مگر اس کی "افادیت" میں کبھی بھی کلام نہیں ہوا۔ اس سے ہر طرز خیال کے لوگ فائدہ اٹھاتے رہے ہیں۔ جب ایک دور میں ذاتی ملکیت کو جائز قرار دینا مقصود تھا تو اسی کا سہارا لیا گیا اور اب جبکہ اسے حرام ٹھہرایا جا رہا ہے تو اس آڑے وقت بھی اسی سے مدد لی جا رہی ہے۔ اس کے اس "سپاہی کردار" کی اصل وجہ یہ ہے کہ اس کی ترتیب و تدوین میں عقل و استدلال سے زیادہ جوش اور جذبات سے کام لیا گیا ہے۔

صنعتی انقلاب کے بعد جب سرمایہ پرستوں کو اس بات کی ضرورت محسوس ہوئی کہ کوئی ایسا اصول وضع کیا جائے جو انہیں کمانے اور صرف کرنے کی مکمل آزادی دے تو انہوں نے یہ کہنا شروع کیا کہ معاشرہ میں ہر

فرد کا یہ پیدائشی حق ہے کہ وہ اپنی گاڑھے پسینے سے کمائی ہوئی دولت کو جس مصرف میں چاہے لے آئے اور اس کے اس فعل پر کوئی قید یا پابندی عائد نہ کی جائے کیونکہ اس نظام کے حامیوں کے نزدیک انسان کبھی کوئی کام پورے جوش و انہماک اور سرگرمی سے نہیں کر سکتا جب تک اسے ذاتی فائدہ اور نفع کی توقع نہ ہو اور اطمینان نہ ہو کہ اپنی محنت سے جو دولت وہ پیدا کرے گا وہ اس کی ملک ہوگی۔ پھر اسے یہ اختیار بھی ہونا چاہیے کہ وہ اپنی دولت کو جس شکل میں چاہے محفوظ رکھ سکے۔ کیونکہ پیدائش کی ہر قسم خواہ وہ کسی مکان کی صورت میں ہو یا کارخانہ کی شکل میں، محض محنت کی ہی کرشمہ سازی ہے۔ چنانچہ آدم سمتھ اور ریکارڈو نے یہ اصول وضع کیا کہ اشیا کی قدر تبادلہ کا اصل معیار مزدوروں کی محنت ہے۔ لاک نے اسی مفروضہ کی بنا پر کہ ہر شئے کو محنت ہی "قدر" بخشتی ہے ذاتی ملکیت کے حق کی پورے زور کے ساتھ تائید کی۔

مارکس نے اپنا نظریۂ قدر (THEORY OF VALUE) انہی حضرات سے مستعار لیا مگر اس نے اس سے بالکل مختلف نتائج اخذ کئے۔ اس نے جب یہ دیکھا کہ دنیا کے لاچار اور بے بس مزدور سرمایہ داروں کے ظالمانہ رویہ کے خلاف سراپا احتجاج بنے ہوئے ہیں تو اس نے اس موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے انہیں یہ بات سمجھائی کہ اشیاء کی پیدائش تو تنہا ان کی محنت کا ثمر ہے، سرمایہ دار محض اپنی مضبوط پوزیشن کی وجہ سے ان کے جائز حصہ میں سے کچھ حصہ سلب کر لیتا ہے۔ لہٰذا انہیں اپنے حقوق کے لیے برسر اقتدار طبقوں کے خلاف صف آرا ہونا چاہیے۔ اپنے اس نظریہ کی وضاحت وہ ایک مثال سے یوں کرتا ہے۔ وہ کہتا ہے فرض کیجیے، ایک مزدور ایک روپیہ روزانہ کے معاوضہ پر روزانہ آٹھ گھنٹے کام پر آمادہ ہو جاتا ہے اور اس طرح اپنی محنت کو ایک روپیہ روزانہ میں سرمایہ دار کے ہاتھوں بیچ دیتا ہے۔ مارکس سوال کرتا ہے کہ اجرت کی یہ شرح کس طرح متعین ہوئی ہے؟ کیا واقعی آٹھ گھنٹے کی محنت ایک روپیہ قیمت رکھتی ہے، پھر خود ہی جواب دیتا ہے کہ یہ اجرت محنت کی حقیقی قیمت کے لحاظ سے متعین نہیں ہوتی ہے۔ جو چیز اس اجرت کے تعین میں فیصلہ کن ہے وہ مزدور کی بے کسی اور بے بسی ہے اور فاقہ کا وہ خوف ہے جو معاشرہ میں کمزور ہونے کی وجہ سے اس کے دل و دماغ پر ہر وقت چھایا رہتا ہے۔ "آفت فردا" اس کے حوصلوں کو بلند نہیں ہونے دیتی اور وہ کم سے کم معاوضہ پر رضامند ہو جاتا ہے ـــــ وہ معاوضہ جو اس کے اور اس کے

اہل و عیال کے محض جسم و روح کے رشتے کو قائم رکھنے کے لیے کافی ہو۔ مزدوروں کی یہ ناداری سرمایہ دار کو خود زبانِ حال سے لوٹنے کی دعوت دیتی ہے۔ چنانچہ ملک کا دولتمند اور با اختیار طبقہ ان کمزوروں کی کمائی پر بے دریغ ہو ڈاکہ ڈالتا ہے اور اس طرح دولت زفت کی رفتار کے ساتھ ایک محدود حلقہ میں مترکز ہو کر رہ جاتی ہے۔

مارکس کے نزدیک چونکہ کسی شے کی اصل قدر صرف محنت ہے اس لیے اس کی قیمت کا واحد اور جائز حقدار بھی صرف مزدور ہی ہے۔ مگر چونکہ اس میں دورِ جدید کے قیمتی آلاتِ پیدائش خریدنے کی ہمت نہیں ہوتی اس لیے وہ مجبوراً اس بات پر تیار ہو جاتا ہے کہ صرف قوتِ لایموت پر قناعت کرے اور بقیہ قدر، جسے قدرِ زائد (SURPLUS VALUE) کہا جاتا ہے ان وسائل مہیا کرنے والوں کو دے دے۔ اس لوٹ کھسوٹ اور "قانونی ڈاکہ زنی" کو ختم کرنے کی اشتراکیوں کے نزدیک صرف ایک ہی صورت ہے کہ ذرائع پیداوار پر ان ظالموں کے قبضہ کو ختم کر کے انہیں پورے طور پر حکومت کے سپرد کر دیا جائے۔

(د) سب سے آخر میں اشتراکیت کا نظریۂ ریاست ہے۔ مارکس سرمایہ دارانہ ریاست کو ایک ایسا ادارہ خیال کرتا ہے جس کی غرض بجز اس کے کچھ نہیں کہ وہ دولتمندوں اور برسرِ اقتدار طبقوں کے مخصوص مفادات کی پاسبانی اور حفاظت کرے۔ ہر عمرانی ادارہ کی طرح ہر سیاسی ادارہ بھی اس کے نزدیک ایک مروجہ نظامِ معیشت کا خارجی قالب ہوتا ہے جس کی قوتِ ناظمہ کے پیشِ نظر "مفادِ کلی" کا استحکام و اثبات نہیں ہوتا بلکہ اس کے وجود کا سب سے بڑا مقصد یہ ہے کہ جن افراد کے ہاتھوں میں دولت آجانے کی وجہ سے اقتدار کی باگیں بھی ہیں انہیں زیادہ سے زیادہ مضبوط کیا جائے۔ اس کی قوت غریبوں کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ اور اس کا نظم مظلوموں کے لیے ایک بے حس زنجیر ہے۔ یہ وہ قفس ہے جس کی بے رحم سلاخیں ہر اس شخص کا سر پھوڑ دیتی ہیں جو ظلم کے ماحول سے گھبرا کر معمولی حرکت بھی کرے۔ اس کے سارے کاموں پر طلسم کا ایک ایسا پردہ پڑا ہوتا ہے جو حقیقت کو بے نقاب نہیں ہونے دیتا اور عوام غلطی سے اسے عدل و انصاف کی ایک میزان خیال کرتے ہیں۔ اس وجہ سے اس کی اطاعت کیشی کا مطلب یہ ہے کہ انسان ظلم و عدوان، جبر و استبداد، بے انصافی اور معاشی استحصال کے سامنے سجدہ ریز ہے۔ مارکس اور انجلس نے اشتمالی منشور میں اسی ادارہ کا ذکر ان الفاظ میں کیا ہے۔

" ریاست ایک طبقہ کو پامال کرنے کا ایک ذریعہ ہے۔ یہ ایک گروہ کو مٹانے اور اس پر مظالم ڈھانے کی ایک تنظیم ہے "

لہٰذا دنیا کے مزدوروں کے لئے اصلاحِ حال کی اگر کوئی صورت ممکن العمل ہے تو وہ صرف یہی ہے کہ اقتدار کو سرمایہ داروں سے چھین کر محنت کش طبقوں کی ایک ایسی جمہوریہ قائم کی جائے جس میں پوری مملکت کا انتظام "معصوم" اور "منزہ عن الخطا" پرولتاریہ کے ہاتھوں میں دے دیا جائے۔

یہ ہیں وہ بنیادی اصول جن پر اشتراکیت کی سر بفلک عمارت تعمیر کی گئی ہے۔

(باقی آئندہ)

اسلام اور تھیاکریسی[1]

(عبد الحمید ؟)

انسانیت نے جو کروٹ دورِ متوسط سے دورِ جدید میں آنے کے لیے لی وہ اپنے نتائج اور اثرات کے اعتبار سے نہایت ہی انقلاب انگیز ثابت ہوئی۔ مذہب کے خلاف ایک شدید جذباتی کشمکش نے، جو اس تبدیلی کی اصل محرک تھی، اس انقلاب کو خالص الحاد کے راستے پر ڈال دیا۔ تہذیب جدید کے معماروں نے کائنات کی بدیہی شہادتوں اور انسانی فطرت کی کھلی پکار کے باوجود مذہب اور اس کے جملہ لوازم مثلاً خدا، آخرت، حشر و نشر، وحی والہام کا انکار کرتے ہوئے انسانی تہذیب کی ساری عمارت کو الحاد پر استوار کیا۔ اخلاق کی وہ ساری قدریں جنہیں انسان ہمیشہ سے عزت و توقیر کی نظر سے دیکھتا رہا تھا وہ سب ملیامیٹ کر دی گئیں اور اب انسانیت نے اپنا سفرِ حیات یہ سوچ کر شروع کیا کہ دنیا کی تباہی اور بربادی کا اصل سبب صرف مذہب ہے۔ اس لیے انہیں چاہیے کہ جو چیز بھی اس سے متعلق ہو اس کے بارے میں بغیر کسی تامل کے یہ سمجھ لیا جائے کہ وہ سراپا "جہالت" ہے۔ اس ردِ عمل کا ایک ہدف "مظلوم" تھیاکریسی (THEOCRACY) بھی ہے۔ یار لوگوں نے اس لفظ کی تشریح و تفسیر مدتہائے دراز سے کچھ اس انداز میں کی ہے کہ اب یہ لفظ مذہبی دیوانوں کی فرمانروائی" کا ہم معنی ہو کر رہ گیا ہے۔ اس کو سنتے ہی آدمی کی آنکھوں میں کچھ اس طرح کا نقشہ پھرنے لگتا ہے کہ چند جاہل مذہبی سرپھرے پُرغضب چہروں، اُچڑھی ہوئی تیوریوں اور شرر فشاں آنکھوں کے ساتھ مسندِ اقتدار پر قابض ہو گئے ہیں اور ان کا مقصدِ حیات صرف یہی ہے کہ معصوم اور بھولے بھالے عوام کو خدا اور آخرت کا نام لے کر ڈرائیں اور ان کے گاڑھے پسینے سے حاصل کی ہوئی کمائی کو ذاتی آرام و آسائش پر بے دریغ صرف کریں۔ ماہرین نے تھیاکریسی کی یہ تصویر بڑی فنکاریوں کے ساتھ

---

[1] اس لفظ کا ترجمہ عام طور پر "حکومتِ الٰہیہ" کیا جاتا ہے مگر چونکہ دونوں کے تصورات میں ایک نمایاں فرق ہے اس لیے ترجمہ دینے کی بجائے اس لفظ کو جوں کا توں رہنے دیا گیا ہے۔

بنائی ہے۔

لطف یہ ہے کہ اس تصویر کے بنانے والے ہمارے وہ مہربان ہیں جو خود صدیوں سے ہر قسم کے اسلحہ سے مسلح ہو کر قزاقوں کی طرح کمزوروں کو لوٹتے رہے ہیں۔ جن کی تنگ نظری، زیادتی اور مردم آزاری نے آج پوری نوعِ انسانی پر عرصۂ حیات تنگ کر دیا ہے، جن کی چیرہ دستیوں، تصادموں اور چالبازیوں کی پوری انسانیت نوحہ خواں ہے۔ مگر ان ماہرینِ فن کی مہارت قابلِ صد ستائش ہے کہ انہوں نے "مذہبی حکومت" کی تصویر اتنی بھیانک اور اتنی بڑی بنائی ہے کہ اُن کی جمہوریت، اشتراکیت اور فسطائیت کی خوفناک تصویریں اس کے پیچھے چھپ گئی ہیں اور خود ہماری سادہ لوحی بھی قابلِ داد ہے کہ جب ہم غیروں کی بنائی ہوئی اس تصویر کو دیکھتے ہیں تو ایسے حواس باختہ ہو جاتے ہیں کہ ہمیں ان تنگ نظر مصوروں کو دیکھنے کا ہوش نہیں رہتا جنہوں نے محض مذہب اور اُس کے نوامیس عالیہ کی تذلیل کے لیے یہ ساری تگ و دو کی ہے اور بڑی ہی لجاجت سے یہ کہنا شروع کر دیتے ہیں "حضور! یہ مذہبی حکومت واقعی دنیا کے لیے بڑی آفت تھی۔ اس سے انسانیت کو ہمیشہ نقصان پہنچا، اس کے نظم کو چلانے والے یہ مذہبی پیشوا بڑے ہی جاہل تھے ان سے کبھی بھی کوئی مفید کام سرانجام نہ پایا۔ یہ لوگ نوعِ انسانیت کو ہمیشہ پیچھے کی طرف لے جانے کی کوشش کرتے رہے۔ ان لوگوں نے مذہب کے نام پر عوام کو لوٹا۔ حضور اب ہماری توبہ۔ ہماری کیا مجال کہ اب ہم ان مذہبی دیوانوں کو حکومت کے ایوانوں میں گھسنے دیں۔ ہمارے سامنے ہمارے ماضی کے قصے نہ دہرائیے بس ایک دفعہ ہمارے پچھلے گناہ معاف کیجیے۔ آئندہ جیتے جی ایسی غلطی کبھی نہیں کریں گے، سرکارِ عالی مدار تو ہم سے خواہ مخواہ بدظن ہوئے جاتے ہیں۔" یہ کلمات مختلف انداز میں مختلف زبانوں سے اس قدر کثرت سے دہرائے گئے ہیں کہ انسان اس بات پر مجبور ہو جاتا ہے کہ تھیاکریسی کی ماہیت معلوم کرے۔

تاریخِ انسانی کا اگر غیر جانبداری سے مطالعہ کیا جائے تو معلوم ہو گا کہ انسانیت کے بعض "بدنام مصلحین" کی طرح یہ لفظ بھی انتہائی مظلوم ہے۔ اسے بھی بعض عیار لوگوں کی ذہنیت کی اُسی طرح شکایت ہے جس طرح کہ خدا کے پاک بندوں کو خدا کے باغیوں کی۔ تاریخ کے اوراق اس حقیقت کے آئینہ دار

ہیں کہ یہ لفظ ہمیشہ ہی ظلم و استبداد کے ہم معنی نہیں رہا بلکہ کبھی اس سے ایک ایسی حکومت کا تصور لیا جاتا تھا جس کے دامن میں شہنشاہیت سے تنگ آئے ہوئے لوگوں نے امن و امان پائی، جس نے انسان پر سے انسان کی خدائی کو ختم کیا، جس نے نوعِ انسانی کے پامال طبقوں کو سہارا دیا، جس نے بنی نوع انسان کو معاشرت کے ایسے پاکیزہ اصول دیئے کہ اُن کی زندگی ہر قسم کی کشاکش اور بے انصافی سے پاک ہو گئی الغرض انسان کو یہ موقع بہم پہنچایا کہ وہ انسانیت کا تاج سر پہ رکھ کر پورے سکون کے ساتھ زندگی بسر کرے۔ اس کے نظم کو چلانے والے بھی سارے بد دیانت اور بے علم نہ تھے بلکہ وہ لوگ تھے جنہوں نے عقل و علم کو چار چاند لگائے، جنہوں نے تہذیب کے گیسو سنوارے اور تمدن کو آخری زینے تک پہنچایا۔ پھر یہ لوگ ہمیشہ عوام پر ظلم ہی نہ کرتے رہے بلکہ بسا اوقات انہی کی مساعی سے جبر و استبداد سرنگوں ہوا، غلامی کی زنجیریں کٹیں۔ اور انسان کو یہ سعادت نصیب ہوئی کہ تمام جھوٹے خداؤں کے بندھن توڑ کر صرف خدائے واحد کی بندگی اختیار کرے۔ یہ لوگ بے کار اور ناکارہ ہی نہ تھے بلکہ صحیح معنوں میں پہاڑی کا چراغ اور زمین کا نمک تھے، یہ لوگوں میں سب سے زیادہ دل کے سچے، علم کے گہرے اور تکلفات سے دور تھے۔ اسی وجہ سے انسانی آبادیوں نے ان کی قیادت پر صرف اعتماد ہی نہ کیا بلکہ ان کا والہانہ استقبال بھی کیا۔ یہ لوگ کوئی خوف و دہشت کی طاقت نہ تھے کہ جس کا نقشہ آج پیش کیا جاتا ہے بلکہ نیکی اور عدالت کا پیغام تھے جس کی طرف لوگ دیوانہ وار بڑھے۔ مغلوب قوموں نے خود انہیں بلا دے بھیجے، قلعوں نے اُن کی امانت پر بھروسہ کرتے ہوئے اپنی کنجیاں خود اُن کے قدموں میں ڈال دیں، دکھوں سے چور انسانیت نے انہیں اپنا نجات دہندہ سمجھا۔ خدا کے یہی وہ پاکباز بندے تھے جنہوں نے اولادِ آدم کی محبت کے لیے جمشید اور قیصر و کسریٰ کے شاہانہ اختیارات کو چیلنج کیا، خسروانہ جلال اور غیر مسئول اقتدار کے سامنے بھی حق بات کہنے سے گریز نہ کیا۔ کبھی اپنی قوم کے ظالم مگر برسرِ اقتدار طبقوں کے خلاف صف آرا ہوئے اور کبھی باہر کے خاقان و فغفور سے جنگ لڑی۔ انہیں کا وجود ہزار ہا سال تک ابتری اور ہلاکت کے راستے میں ایک بڑی روک کا کام دیتا رہا ہے اور انسانیت کو ان تمام فتنوں اور خطرات سے جو عالم پہ محیط تھے عرصہ تک کے لیے محفوظ کر دیا۔ اولادِ آدم ان کے احسانات

سے کبھی بھی سبکدوش نہیں ہوسکتی۔ مشہور مصنف رابرٹ بریفالٹ (ROBERT BRIFFALT.) اپنی شہرۂ آفاق تصنیف "تعمیرِ انسانیت" (THE MAKING OF HUMANITY) میں بڑے ہی واشگاف الفاظ میں ان لوگوں کی خدمات کا اعتراف کرتا ہے اور بتاتا ہے کہ مغرب میں خواہ اس تھیاکریسی کا کچھ ہی تصور ہو مگر مشرق میں یہ حکومت ہمیشہ انسانی فلاح کی ضامن رہی چنانچہ وہ اپنی کتاب میں لکھتا ہے :-

"مشرق میں تھیاکریسی کبھی بھی ذہنی استبداد کا موجب نہیں بنی، ہم یہاں ظلمت پسندی خیالات پر قدغن، اور علم پر پابندی کی کوئی ایسی مثال نہیں پاتے جس کے لیے کہ مغربی دنیا یونان اور روم سمیت مشہور رہے ہے۔

مگر داد دیجئے مغربی دقتِ نظر کی کہ انہوں نے "مذہبی حکومت" کا نقشہ کھینچتے وقت ان ادوار کا انتخاب کیا ہے جب یہ حکومتیں انحطاط کی لپیٹ میں آچکی تھیں۔ مذہب جو ان حکومتوں کی اصل بنیاد تھی وہ کوئی انقلاب انگیز قوت نہ رہا تھا بلکہ چند بے جان اور بے روح رسوم کا مجموعہ بن چکا تھا۔ ان کے چلانے والے بھی اس "پیغام" کو بھول گئے تھے جس کی تڑپ نے انہیں اپنے آپ کو ایک مخصوص اجتماعی قالب میں ڈھالنے پر مجبور کیا۔ انہوں نے آسان پسندی اور سہل انگاری کے طریقوں کو اختیار کرتے ہوئے سوچنا اور دریافت کرنا چھوڑ دیا، اور اکتسابِ علم اور اجتہادِ فکر کی راہ میں تھک کر بیٹھ گئے۔ پھر وہ دین جس کی وجہ سے انہیں یہ عزت حاصل ہوئی تھی اس کی محبت دلوں سے غائب ہوگئی اور اس کی جگہ دنیا پرستی نے لے لی۔ اب اگر مفکرین کا کوئی گروہ مذہبی حکومت کے روشن اور تابناک ادوار کو قصداً چھوڑ کر صرف اس کے دورِ انحطاط کو نظر میں رکھ کر اس کی تصویر بناتا ہے تو اسے علمی خیانت کے علاوہ اور کیا کہا جاسکتا ہے۔ اس پر مزید ستم یہ کہ ان حضرات نے بغیر کسی ادنیٰ تحقیق کے اسلامی حکومت کو بھی اس "تھیاکریسی" کے زمرہ میں شامل کر دیا ہے حالانکہ جس شخص نے "تاریخ" کا ایک سرسری سا مطالعہ بھی کیا ہے وہ اس حقیقت سے بخوبی واقف ہے کہ پوری تاریخِ اسلامی میں ہمیں کوئی دور ایسا نظر نہیں آتا

له ROBERT BRIFFAULT: THE MAKING OF HUMANITY, P. 113.

جبکہ ملتِ اسلامیہ نے اپنا اجتماعی ڈھانچہ تھیاکریسی کے فرضی نمونہ پر تیار کیا ہو۔ یہ بات ایک دعویٰ کے ساتھ کہی جاسکتی ہے کہ مسلمان اپنی سیاسی اور معاشرتی زندگی میں زوال کی آخری سرحدوں کو چھونے کے بعد بھی اُن ساری بے اعتدالیوں سے پاک رہے جن کو کہ عام طور پر مذہبی حکومت کی طرف منسوب کیا جاتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ جن عقلی اور اخلاقی عناصر سے اس قوم کی تعمیر ہوئی ہے وہ اتنی عمدہ، ٹھوس اور پائیدار ہیں کہ انہوں نے کسی ایسی برائی کو جوان کے مزاج کو بدل دے اپنے اندر گھسنے نہیں دیا۔ اور جب کبھی اس قسم کی کوشش کی گئی تو وہ سخت ناکام ثابت ہوئی۔

پیشتر اس کے کہ ہم اسلامی حکومت اور تھیاکریسی کے درمیان جو عظیم فرق پایا جاتا ہے اُس کی وضاحت کریں یہ ضروری معلوم ہوتا ہے کہ ہم "مذہبی حکومت" کے متعلق وہ روایات جو عام طور پر مشہور ہیں اُن کا بھی ایک مختصر سا جائزہ لے لیں اس سے آنے والے مبحث کو سمجھنے میں کافی حد تک آسانی رہے گی۔

تھیاکریسی کی اصطلاح عام طور پر ایک ایسی ریاست کے لیے بولی جاتی ہے جو مذہب کی بنیاد پر قائم ہو، جس میں سارا اختیار ایک ایسے فرد یا گروہ کے ہاتھ میں ہو جو یا تو اپنے آپ کو مظہر خدا سمجھے یا اُس سے براہِ راست راہنمائی حاصل کرنے کا دعویٰ رکھتا ہو یہ اصطلاح سب سے پہلے قدیم یہودی مؤرخ جوزیفس نے وضع کی اور اس سے مقصود وہ اندازِ حکومت تھا جو بنی اسرائیل کی زندگی میں رائج تھا۔ ان حکومتوں میں سیاسی اقتدار یا تو براہِ راست ایک مخصوص مذہبی طبقہ کے ہاتھ میں ہوتا یا یہ گروہ اقتدار کے تخت پر متمکن ہونے والوں کی حفاظت اور پاسبانی کے فرائض سرانجام دیتا۔ خدا کے احکام حاصل کرنے کا طریقہ اُن کے ہاں یہ تھا کہ وہ سب مل کر اپنے میں سے ایک انسان کا انتخاب کر لیتے اور پھر اُسے یہ حق تفویض کر دیتے کہ وہ اکیلا اُن کی طرف سے خداوند تعالیٰ سے ہمکلام ہو کر اُس کا منشا معلوم کر کے انہیں اس سے آگاہ کرے۔ ان احکام کی بجا آوری بجز اس طبقہ کے سب پر لازم تھی آغاز میں تو سارا اختیار اسی گروہ کے قبضہ میں رہا مگر وقت کے گزرنے کے ساتھ بادشاہ بھی اپنے آپ کو خداوند تعالیٰ کی اس "نوازش" کا حقدار سمجھنے لگا۔ اور اسی طرح اس طبقہ میں یہ ہمت نہ رہی کہ وہ

حکمراں کے کسی قول یا فعل پر کسی قسم کی لب کشائی کرنے کی جرأت کرے۔ البتہ اُس کے مرنے کے بعد ایک مجلس منعقد کی جاتی اور اُس میں اُس کے اعمال کو جانچ کر یہ فیصلہ کیا جاتا کہ آیا مرنے والا بادشاہ جنت کا مستحق ہے یا دوزخ کا۔ ان لوگوں کا یہ فیصلہ اس کے جانشین کے لیے نہایت اہم ہوتا۔

اگر ہندوستان کی تاریخ کا مطالعہ کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ یہاں بھی حکومت کا یہی تصور موجود تھا۔ آغاز میں برہمن کے مقابلہ میں بادشاہ کی حیثیت نہایت ہی ادنیٰ اور کمزور تھی مگر جس رفتار سے اُس کی سلطنت کی حدود پھیلیں، اور اُس کے اقتدار میں اضافہ ہوا اُسی نسبت سے اُس کے اندر الوہیت پیدا ہوتی گئی۔ اور برہمنوں کی یہ ہمت نہ رہی کہ وہ اس کے متعلق کوئی نازیبا کلمہ زبان پر لائیں۔ منو کی جو تعلیمات اس وقت بھی ملتی ہیں اُن سے یہی بات واضح ہوتی ہے۔ بادشاہ کا جسم اُن کے اقوال کے مطابق بالکل پاک اور مقدس ہے۔ کیونکہ وہ ایسے عناصر سے عبارت ہے جن کو جنت میں تیار کیا گیا ہے۔ جس طرح سورج کی روشنی کے سامنے کوئی فرد بھی اپنی آنکھیں کھولنے کی جرأت نہیں کرتا اسی طرح کسی فرد کو بھی بادشاہ کی طرف نگاہ اُٹھانے کی گستاخی نہیں کرنا چاہیے۔ کسی انسان کے لیے یہ مناسب نہیں کہ وہ اسے بچپن میں بھی نفرت کی نگاہ سے دیکھے یا اُس کے متعلق یہ گمان کرے کہ وہ تو محض "بشر" ہے۔ اس تعلیم کا اثر یہ ہوا کہ کبریائی کے جس مقام پر پہلے برہمن فائز تھا اُس پر اب بادشاہ فائز ہو گیا اور عوام کی جبینِ نیاز اسی "رب" کے سامنے جھکنے لگی۔ کسی شخص کو یہ حق حاصل نہ تھا کہ وہ اس کے کسی فعل پر نکتہ چینی کرے کیونکہ وہ خود اس زمین پر خدا کا مظہر تھا۔ دَورِ جدید میں اس طرزِ حکومت کی مثالیں تبت اور جاپان میں ملتی ہیں۔

مذہبی حکومت کے ان سارے تصورات میں سے غالباً سب سے زیادہ عجیب و غریب تصور وہ ہے جو ہمیں یہودیوں سے ملا ہے۔ اُن کا عقیدہ یہ تھا کہ یہودہ خود کسی ابر آلودہ رات میں بجلی کی چمک کے ساتھ انہیں اپنے احکام سے نوازتا۔ اس کے علاوہ ان کے ہاں خدا کی منشا اور مرضی کو معلوم کرنے کا ایک اور طریقہ بھی موجود تھا۔ اُن کا کاہنِ اعظم خیمۂ عبادت میں قدس الاقداس کے اندر جاتا جہاں تابوت ایک پردہ کے پیچھے رکھا ہوتا۔ یہ مقام الہام ربانی کا مرکز خیال کیا جاتا تھا۔ وہاں پہنچ کر اس پر یہودہ کے احکام

الہام ہوتے۔ وہ ان احکام سے لوگوں کو روشناس کرتا اور لوگوں پر ان کی اطاعت فرض ہوتی۔ بلنچلی (BLUNTSCHLI) اپنی کتاب نظریۂ ریاست (THE THEORY OF STATE) میں نہایت ہی خوبی سے ان احکام کو حاصل کرنے کے طریقہ کا نقشہ کھینچتا ہے۔ وہ کہتا ہے:۔

"قانونِ الٰہی ایک سونا منڈھے ہوئے صندوق میں رکھا رہتا جس کی وہ کڑی حفاظت کرتے اور جس کی تعظیم الہامِ ربانی کے مرکز کی حیثیت سے کی جاتی تھی۔ تابوت خیمہ کے اندر ایک پردہ کے پیچھے قدس الاقداس میں رہتا تھا اور کاہنوں کی طرف سے پورے اہتمام سے اس کی نگرانی ہوتی تھی۔ یہیں کاہن اعظم یہوہ کے احکام معلوم کرتا اور لوگوں کو مطلع کرتا۔"

"قضاۃ جو قبائل میں شریعت کی تنفیذ پر مامور تھے وہ یہ کام خدا کے نام پر سرانجام دیتے تھے کیونکہ قانون سازی کا حق صرف اللہ کے لیے مخصوص تھا اگر کوئی معاملہ ان کے سامنے ایسا آجاتا جس کا فیصلہ ان کے لیے مشکل ہوتا تو اس میں ان کے لیے ضروری ہوتا کہ لاویوں کے ذریعہ خدا کی مرضی معلوم کریں[۱]۔"

قریب قریب یہی حال نصاریٰ کا بھی تھا۔ یورپ کا پاپائی نظام سینٹ پال کا پیرو تھا جس نے موسوی شریعت کو لعنت قرار دے کر مسیحیت کی بنیاد صرف اُن اخلاقی تعلیمات پر رکھی تھی جو نئے عہدنامہ میں پائی جاتی ہیں۔ ان اخلاقی تعلیمات میں کوئی ایسا قانون موجود نہیں ہے جس پر ایک تمدن اور ایک ریاست کا نظام چلایا جاسکے۔ اس لیے جب انہیں ایک نظام حکومت قائم کرنا پڑا تو اُن کے سامنے اس کے سوا کوئی چارہ نہ تھا کہ وہ اپنی مرضی سے اپنی خواہشاتِ نفس کے مطابق قوانین وضع کر کے نافذ کرتے اور پھر کہتے کہ یہ خدا کی طرف سے ہیں۔

تھیاکریسی کے ان مختلف مظاہر کو سامنے رکھ کر اگر ان کا مطالعہ کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ ان میں باوجود ہزار اختلافات کے جو چیز قدرِ مشترک کی سی حیثیت رکھتی ہے وہ یہ ہے کہ اس میں عنانِ اقتدار ان افراد کے ہاتھ میں ہوتی ہے جو عام انسانوں سے بلند اور بالا ہونے کے ساتھ ساتھ حاکمیت کے

[۱] BLUNTSCHLI: THE .... OF STATE PP. 350 – 351.

حقوق بھی رکھتے ہیں۔ یہ لوگ صرف فوق البشر ہونے کے دعویدار ہی نہیں ہوتے بلکہ اپنے آپ کو مستقل بالذات شارع اور قانون ساز بھی سمجھتے ہیں۔ اس لحاظ سے اُن کی حیثیت ایک مطلق العنان کی سی ہوتی ہے جس پر مخلوق کسی قسم کی کوئی تنقید نہیں کر سکتی۔

دنیا کی بد قسمتی کہ مذہبی حکومت سے متعلق ان سارے غلط تصورات کو تھیاکریسی کا نام دے کر اسلامی حکومت کو بھی انہی معنوں میں ایک مذہبی حکومت سمجھ لیا گیا ہے۔ غیر تو غیر خود مسلمانوں کا ایک اچھا خاصا طبقہ بھی اس سے یہی مراد لیتا ہے۔

جب ہم اس عظیم غلط فہمی کے اسباب و علل کا تجزیہ کرتے ہیں تو ہمیں اس کے تین اسباب نظر آتے ہیں۔

- اسلام کو اُن معنوں میں ایک مذہب سمجھ لیا گیا ہے جن میں یہ لفظ عموماً بولا جاتا ہے۔
- اسلامی ریاست اور یہودی اور عیسائی ریاستوں کے اساسی تصورات میں جو اختلاف ہے انہیں نظر انداز کر دیا جاتا ہے۔
- عقیدہ ختمِ نبوت کے سیاسی اور تمدنی پہلوؤں پر غور نہیں کیا جاتا۔

مذہب کے معنی عام اصطلاح کے اعتبار سے بجز اس کے اور کیا ہیں کہ وہ چند عقائد اور عبادات اور مراسم کا ایک مجموعہ ہے۔ اس لحاظ سے مذہب کو واقعی خدا اور انسان کے درمیان ایک پرائیویٹ رشتہ ہونا چاہیے۔ مگر اسلام کا معاملہ اس سے بالکل جدا ہے۔ اُس کا اپنا ایک الگ اور مخصوص نظریۂ حیات ہے جو زندگی کے سارے شعبوں پر پوری طرح حاوی ہے۔ اس لحاظ سے مسلمان زندگی کے ہر گوشے میں خواہ اُس کا تعلق اُن کی سیاسی زندگی سے ہو یا اُن کی روحانی زندگی سے مستقل اقدار کے حامل ہیں، وہ ایک متعین اسلوب حیات اور انداز زیست کے مالک ہیں۔ اُن کا مسلمان ہونا اس بات کا متقاضی ہے کہ وہ زندگی کے سارے خانوں میں صرف اسلام کا رنگ بھریں۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے زندگی کے سارے معاملات تہذیب و معاشرت، اخلاق و اجتماع، آئین و سیاست علم و فلسفہ کے لیے نہایت واضح احکام صادر فرما دیے ہیں۔ ان احکام کی موجودگی میں مسلم قوم کو کسی قدس الاقداس یا کاہن اعظم کی ضرورت

نہیں رہتی جو انہیں خدا سے ہمکلام ہو کر اُس کے منشا سے واقف کرے۔ عقیدہ ختم نبوت نے فساد کے ان سارے راستوں کو اچھی طرح مسدود کر دیا ہے۔

یہود اور نصاریٰ کو جس چیز نے تھیاکریسی کے اس دام میں پھنسا دیا وہ یہ تھی کہ اُن کے مذاہب کی تعلیمات صرف اخلاق تک ہی محدود ہیں ان کی مدد سے نہ تو زندگی کا کوئی پورا نقشہ اور نہ ہی اس کا کوئی مکمل ڈھانچہ تیار کیا جا سکتا تھا۔ چنانچہ ان مذاہب کے پیروؤں نے جب اجتماعی زندگی کی تعمیر کرنا چاہی تو لامحالہ انہیں راہنمائی کے لیے مذہبی طبقوں پر ہی اعتماد کرنا پڑا۔ ان لوگوں نے اس موقع کو غنیمت جان کر اپنے ذاتی نظریات کو الہام کی حیثیت سے پیش کر دیا۔

ان قوموں کی گمراہی کی ایک اور وجہ یہ بھی تھی کہ ان کے پاس ان مذاہب کے بانیوں کی زندگی کے لیے مکمل حالات موجود نہ تھے جن سے زندگی کے سارے معاملات میں رشد و ہدایت حاصل کی جا سکتی۔ ان مقدس لوگوں کی سیرت کو ان کے اپنے ماننے والوں نے اس بری طرح سے مسخ کیا کہ سوائے چند معجزات اور خرق عادت واقعات کے اور کوئی چیز باقی نہ رہی۔ ظاہر بات ہے کہ سیرتوں کے یہ ادھورے اور نامربوط اجزا کسی کامل زندگی کی تقلید اور پیروی کا سامان فراہم نہ کر سکتے تھے۔ اور یہی وجہ تھی کہ مفسدوں کو شر اور فساد پھیلانے کے لیے ایک نہایت ہی سازگار ماحول میسر آیا۔ مگر اسلام کا معاملہ اس کے بالکل برعکس ہے۔ یہاں سرور کونین کی حیاتِ طیبہ کی جس جذب و شوق کے ساتھ حفاظت کی گئی ہے وہ اب بھی عالم کے لیے مایۂ حیرت ہے۔ اسلام کے شیدائیوں نے جس محنت اور عرق ریزی سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اقوال، افعال، اور متعلقات زندگی کو محفوظ کیا ہے۔ اُس کی مثال دنیا کی تاریخ میں کہیں نہیں ملتی۔ مسلمان تو مسلمان بلکہ نہایت متعصب قسم کے غیر مسلم بھی اس حقیقت کو ماننے پر مجبور ہیں چنانچہ جان ڈیون پورٹ (JHON DEVON PORT) اپنی کتاب اپالوجی فار محمدؐ اینڈ دی قرآن (APOLOGY FOR MUHAMMAD AND THE QURAN) کا آغاز ان الفاظ سے کرتا ہے:۔

"اس میں کچھ شبہ نہیں کہ تمام مقنن اور فاتحین میں ایک بھی ایسا نہیں ہے کہ جس کے وقائع عمری، محمدؐ کے وقائع عمری سے زیادہ مفصل اور سچے ہوں"

ریورنڈ باسورتھ اسمتھ (BASWORTH SMITH) فیلو آف ٹرینٹی کالج آکسفورڈ نے ۱۸۷۴ء میں "محمد اینڈ محمڈنزم" کے نام سے جو لیکچر دیئے ہیں اُن میں اس حقیقت کا یوں اعتراف کیا گیا ہے:

"جو کچھ عام طور سے مذہب کی ابتدا نامعلوم ہونے کی نسبت صحیح ہے ان تین مذہبوں اور ان کے بانیوں کی نسبت بھی صحیح ہے جن کو ہم کسی بہتر نام موجود نہ ہونے کے سبب سے تاریخی کہتے ہیں۔ ہم مذہب کے اولین اور ابتدائی کارکنوں کی نسبت بہت کم اور ان کی نسبت جنہوں نے ان کی محنتوں میں بعد کو اپنی محنتیں ملائیں، شاید زیادہ جانتے ہیں، ہم زرتشت اور کنفیوشس کے متعلق اس سے بہت کم جانتے ہیں، جو سولن اور سقراط کے متعلق جانتے ہیں۔ موسیٰ اور بدھ کے متعلق اس سے کم واقف ہیں جو ہم امبروس (AMBROSE) اور سیزر کے بارے میں جانتے ہیں۔ ہم درحقیقت مسیح کی زندگی کے ٹکڑوں میں سے صرف ایک ٹکڑے سے واقف ہیں۔ ان تیس برسوں کی حقیقت سے کون پردہ اٹھا سکتا ہے، جس نے تین سال کے لیے راستہ تیار کیا۔ جو کچھ ہم جانتے ہیں اس نے دنیا کی ایک تہائی کو زندہ کیا ہے، اور شاید اور بہت زیادہ کرے، ایک مثالی زندگی جو بہت دور بھی ہے اور قریب بھی ممکن بھی ہے اور ناممکن بھی، لیکن کتنا حصہ ہے جو ہم جانتے ہی نہیں۔ ہم مسیح کی ماں، اُن کی خانگی زندگی، ان کے ابتدائی احباب، ان کے ساتھ ان کے تعلقات، ان کے روحانی مشن کا تدریجی طلوع، یا یک بیک ظہور کی نسبت ہمیں کیا معلومات حاصل ہیں؟ ان کی نسبت کتنے سوالات ہم میں سے ہر ایک کے ذہن میں پیدا ہوتے ہیں جو ہمیشہ سوالات ہی رہیں گے۔ لیکن اسلام میں ہر چیز ممتاز ہے وہ یہ کہ یہاں دھندلا پن اور راز نہیں ہے۔ ہم تاریخ رکھتے ہیں، ہم محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق اس قدر جانتے ہیں، جس قدر لوتھر اور ملٹن کے متعلق جانتے ہیں۔ میتھالوجی، فرضی افسانے اور مافوق الفطرت واقعات ابتدائی عرب مصنفین میں نہیں ہیں یا اگر ہیں تو وہ آسانی سے تاریخی واقعات سے الگ کیے جا سکتے ہیں۔ کوئی شخص یہاں نہ خود کو دھوکا دے سکتا ہے اور نہ دوسرے کو دے سکتا ہے۔ یہاں پورے دن کی روشنی ہے، جو ہر چیز پر پڑ رہی ہے، اور ہر ایک تک وہ پہنچتی ہے۔"[1]

[1] بحوالہ خطبات مدراس۔ از مولانا سید سلیمان ندوی

خدا کی نازل کردہ کتاب اور نبی آخرالزمان کی مقدس زندگی جو دراصل اسی کلام کی تعلیم کا ہی ایک عملی مجسمہ اور پیکر ہے، اس کے دائرے اتنے وسیع اور محیط ہیں کہ زندگی کے کسی گوشے میں بھی کسی فتنہ پرواز کے لیے فتنہ کھڑا کرنے کی گنجائش نہیں چھوڑتے۔ اسلام نے اپنے نبی (فداہوں میرے ماں باپ اُن پر) کی تعلیم اور عمل، لفظاً اور اس کے مصداق دونوں کو اس خوبی سے محفوظ کیا ہے کہ اب کوئی عیار بھی اس ذریعہ سے لوگوں کو فریب نہیں دے سکتا۔ ہادی برحق نے اس دنیا سے رخصت ہوتے ہوئے یہی فرمایا تھا۔

ترکت فیکم الثقلین کتاب اللہ و سنتی۔ — میں تم میں دو مرکزِ ثقل چھوڑ رہا ہوں خدا کی کتاب اور اپنا عملی راستہ۔

چنانچہ مسلمانوں کی تاریخ کا ہر ورق اس حقیقت کا شاہد ہے کہ مسلمانوں نے بعد کے ادوار میں اگرچہ اسلامی تعلیمات سے کسی حد تک بے تعلقی کا مظاہرہ کیا مگر انہوں نے کبھی بھی دین کے ان دو قلعوں میں رخنے پیدا کرنے کی جرأت نہ کی۔ وہ باوجود اپنی بے عملی کے اسی قرآن اور سنت کو اپنا آخری راہنما اور ثالث تسلیم کرتے رہے اور اس بات کے لیے ہمیشہ کوشاں رہے کہ اسی کی روشنی میں اپنا زندگی کا سفر طے کریں۔ انہیں کبھی بھی اس کی ضرورت محسوس نہ ہوئی کہ وہ اپنے میں سے کسی کو طور کی چوٹی پر بھیج کر خدا کی منشا اور رضا کو معلوم کریں۔ اُن کے دلوں میں یہ خیال ہمیشہ راسخ رہا کہ وہ اسی قرآن اور سنت کی بدولت اپنی ہستی سے شعلۂ سینائی پیدا کرنے کی قدرت رکھتے ہیں۔ اس لیے مسلم قوم بحیثیت مجموعی تھیاکریسی کے سارے فتنوں سے محفوظ رہی اور جب کبھی کسی کوتاہ اندیش نے اس کا عزم بھی کیا تو دین کے خدائیوں نے اس کے ناپاک ارادوں کو بالکل ناکام بنا دیا۔

یہی نہیں بلکہ اسلام نے انسانوں سے حاکمیت کے حقوق کو بالکل سلب کر کے حیاتِ انسانی میں شر کے اصل سرچشمہ کو ہمیشہ کے لیے ختم کر دیا ہے، وہ چیز جو انسان کے سارے مصائب، اس کی ساری تباہ کاریوں، اس کی تمام محرومیوں کی اصل جڑ ہے وہ یہ ہے کہ انسان اقتدار کے نشہ میں خود انسان کا خدا بن جاتا ہے۔ ان مذہبی ریاستوں میں بھی فتنے کا آغاز اسی سے ہوا کہ ایک طبقہ نے صرف اپنے آپ کو ہی خدا کی کتاب کا اصل حامل قرار دیتے ہوئے دوسروں کو اس کے علم سے بالکل محروم کر دیا اور خود اپنے زعم میں خدا کی

نہ بان بن کر حلال و حرام کے احکام صادر کرنے لگا، اس طرح اُن کی ذاتی آرا کو الہام کی سی حیثیت حاصل ہو گئی اور وہ انسانوں کو خدا کی بجائے خود اپنے احکام کا تابع بنانے میں کامیاب ہو گئے۔

قرآن حکیم کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ کفار اور مشرکین اور انبیاء علیہم السلام کی لڑائی کا محور صرف یہی باطل عقیدہ تھا۔ کفار اللہ کو اپنا رب۔ اس کائنات کا خالق اور اس کا مالک تو تسلیم کرتے تھے مگر وہ اسے اس کا فرماں روا اور قانون ساز نہ سمجھتے تھے۔ چنانچہ قرآن مجید میں اس بحث کے بیشمار نمونے ملتے ہیں۔ یہاں صرف چند مثالیں پیش کی جاتی ہیں۔

قُلْ لِّمَنِ الْاَرْضُ وَمَنْ فِيْهَآ اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ، سَيَقُوْلُوْنَ لِلّٰهِ ۔ قُلْ اَفَلَا تَذَكَّرُوْنَ ؟ قُلْ مَنْ رَّبُّ السَّمٰوٰتِ السَّبْعِ وَرَبُّ الْعَرْشِ الْعَظِيْمِ ، سَيَقُوْلُوْنَ لِلّٰهِ قُلْ اَفَلَا تَتَّقُوْنَ ؟ قُلْ مَنْۢ بِيَدِهٖ مَلَكُوْتُ كُلِّ شَيْءٍ وَّهُوَ يُجِيْرُ وَلَا يُجَارُ عَلَيْهِ اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ؟ سَيَقُوْلُوْنَ لِلّٰهِ قُلْ فَاَنّٰى تُسْحَرُوْنَ ۔ (المومنون ۵)

ان سے پوچھو کہ زمین اور جو کچھ زمین میں ہے وہ کس کا ہے، بتاؤ اگر تم جانتے ہو؟ وہ کہیں گے اللہ کا ہے، کہو پھر تم غور نہیں کرتے۔ ان سے پوچھو، ساتوں آسمانوں کا رب اور عرش عظیم کا رب کون ہے؟ کہیں گے اللہ۔ تو پھر تم اس سے ڈرتے نہیں؟ ان سے پوچھو وہ کون ہے جس کے ہاتھ میں ہر چیز کا اختیار ہے اور وہ سب کو پناہ دیتا ہے مگر کوئی اس کے مقابلے میں کسی کو پناہ نہیں دے سکتا؟ بتاؤ اگر تم جانتے ہو؟ وہ کہیں گے کہ اللہ۔ کہو پھر تم کس دھوکے میں ڈال دیئے گئے ہو۔

وَلَئِنْ سَاَلْتَهُمْ مَّنْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ وَسَخَّرَ الشَّمْسَ وَالْقَمَرَ لَيَقُوْلُنَّ اللّٰهُ فَاَنّٰى يُؤْفَكُوْنَ ۔ وَلَئِنْ سَاَلْتَهُمْ مَّنْ نَّزَّلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَاَحْيَا بِهِ الْاَرْضَ مِنْۢ بَعْدِ مَوْتِهَا لَيَقُوْلُنَّ اللّٰهُ ۔

اگر تم ان سے پوچھو کہ کس نے آسمانوں اور زمین کو پیدا کیا ہے اور کس نے سورج اور چاند کو تابع فرمان بنا رکھا ہے وہ ضرور کہیں گے کہ اللہ نے پھر یہ آخر کدھر بھٹکائے جا رہے ہیں؟ اور اگر تم ان سے پوچھو کہ کس نے آسمان سے پانی اتارا اور کس نے مری ہوئی زمین کو روئیدگی بخشی؟ وہ ضرور کہیں گے کہ اللہ نے۔

سوال یہ ہے کہ اگر اس جھگڑے کی بنیاد خدا کا انکار نہیں تھی تو اور کیا تھی۔ قرآن کہتا ہے یہ ساری نزاع اس بات پر تھی کہ خدا کے مرسلین کہتے تھے کہ جس خدا کو تم اس زمین و آسمان کا خالق مانتے ہو اُسے اپنا الٰہ، حاکمیت کا واحد مالک اور قانون ساز بھی سمجھو۔ اُس کی اس بادشاہت میں کسی فرد یا گروہ کو یہ حق نہیں پہنچتا کہ وہ اپنا قانون جاری کرے۔ اگر کوئی شخص یا طبقہ ایسا کرتا ہے تو وہ اللہ تعالیٰ کی خدائی میں ساجھا بٹانے کی جرأت کا مرتکب ہوتا ہے۔ چنانچہ قرآن حکیم انہی وجوہ کی بنا پر یہود و نصاریٰ دونوں کو اس امر کا مجرم قرار دیتا ہے۔

اِتَّخَذُوْٓا اَحْبَارَهُمْ وَرُهْبَانَهُمْ اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَالْمَسِيْحَ ابْنَ مَرْيَمَ وَمَآ اُمِرُوْٓا اِلَّا لِيَعْبُدُوْٓا اِلٰهًا وَّاحِدًا لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ سُبْحٰنَهٗ عَمَّا يُشْرِكُوْنَ ۔

انہوں نے اپنے عالموں اور راہبوں کو اللہ کے سوا رب ٹھیرا لیا ہے اور مسیح ابن مریم کو حالانکہ ان کو نہیں حکم دیا گیا ہے مگر اس بات کا کہ ایک ہی خدا کی بندگی کریں۔ جس کے سوا کوئی الٰہ نہیں۔ وہ پاک ہے ان چیزوں سے جن کو یہ خدا کا شریک ٹھیراتے ہیں۔

اس آیت کی تشریح خود نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے جس طریق سے بیان فرمائی ہے وہ صورت حال کو سمجھنے کے لیے نہایت ضروری ہے۔ عدی بن حاتم نے حضورِ عالم سے یہ پوچھا کہ یہود و نصاریٰ اپنے عالموں اور راہبوں کو رب تو نہیں کہتے؟ آپ نے فرمایا کہ کیا یہ بات نہیں ہے کہ اللہ نے جو چیزیں حلال قرار دی ہیں ان کو وہ حرام کرتے ہیں تو تم ان کو حرام قرار دیتے ہو اور جن چیزوں کو اللہ نے حرام کیا ہے ان کو وہ حلال کر دیتے ہیں۔ تو تم ان کو حلال قرار دے دیتے ہو۔ عدی بن حاتم نے کہا۔ ہاں یہ بات تو ہے حضور نے فرمایا: فَتِلْكَ عِبَادَتُهُمْ یہی ان کی عبادت ہے۔ اسلام نے جس طریق سے حاکمیت پر سے افراد یا طبقوں کے تسلط کو ختم کیا ہے اُس سے اس قسم کے سارے فتنے خود بخود مٹ گئے ہیں۔ اور اب اسلامی حدود میں ان کو سر اٹھانے کی کبھی بھی جرأت نہیں ہو سکتی۔ یہاں فرد تو کیا پوری انسانیت کو بھی یہ حق حاصل نہیں کہ وہ اپنی طرف سے کہی ہوئی کسی بات کو خدا کی طرف منسوب کرے یا اُسے اس حیثیت سے پیش کرے کہ وہ فرمان الٰہی ہے۔ چنانچہ قرآن پاک نے جس بلیغانہ انداز میں اس حقیقت کو واضح فرمایا ہے اُس سے اس مسئلہ کی اہمیت

کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے :۔

اِنِ الْحُكْمُ اِلَّا لِلّٰهِ ۔ اَمَرَ اَلَّا تَعْبُدُوْٓا اِلَّآ اِيَّاهُ ۔ ذٰلِكَ الدِّيْنُ الْقَيِّمُ ۔

حکم سوائے اللہ کے کسی اور کا نہیں۔ اس کا فرمان ہے کہ اس کے سوا کسی اور کی بندگی نہ کرو۔ یہی صحیح دین ہے۔

يَقُوْلُوْنَ هَلْ لَّنَا مِنَ الْاَمْرِ مِنْ شَيْءٍ ۚ اِنَّ الْاَمْرَ كُلَّهٗ لِلّٰهِ ۔

وہ پوچھتے ہیں کہ اختیارات میں ہمارا بھی کچھ حصہ ہے؟ کہو کہ اختیارات تو سارے اللہ کے ہاتھ میں ہیں۔

وَلَا تَقُوْلُوْا لِمَا تَصِفُ اَلْسِنَتُكُمُ الْكَذِبَ هٰذَا حَلٰلٌ وَّهٰذَا حَرَامٌ

اپنی زبانوں سے یونہی غلط سلط نہ کہہ دیا کرو کہ یہ حلال ہے اور یہ حرام ہے۔

اَلَا لَهُ الْخَلْقُ وَالْاَمْرُ (اعراف)

خبردار خلق اور امر اللہ کے لیے ہی ہے۔

ان آیات شریفہ سے اس امر کی پوری طرح صراحت ہو جاتی ہے کہ قرآن پاک کی رو سے حکمرانی، فرماں روائی، اور قانون سازی، کا اصل حق صرف ذات باری تعالیٰ کو حاصل ہے۔ انسان خواہ کتنا ہی بڑا کیوں نہ ہو بہر حال بندہ ہے اور اس لحاظ سے اُسے یہ بات کسی صورت بھی زیب نہیں دیتی کہ وہ اپنی اصل اور جائز حدود سے تجاوز کر کے مقام کبریائی پر فائز ہونے کا دعویٰ کرے۔ حاکمیت خواہ سلاطین و ملوک کی ہو، امراء و حکما کی ہو، خاندانوں اور نسلوں کی ہو، علماء و احبار و رہبان کی ہو، جمہوریت و وطنیت کی ہو، خواہ خود اُس کے اپنے نفس کی ہی کیوں نہ ہوں یہ سراسر باطل ہے، اس کلیہ میں کوئی استثنا نہیں، اس اصول میں کوئی لچک نہیں۔ حاکمیت کا حق عام انسانوں کو تو کیا انبیاءؑ تک کو بھی نہیں دیا گیا حتیٰ کہ خداوند تعالیٰ کے سب سے برگزیدہ نبی محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان پاک سے بھی یہ الفاظ کہلوائے گئے۔

مَا كَانَ لِبَشَرٍ اَنْ يُّؤْتِيَهُ اللّٰهُ الْكِتٰبَ وَالْحُكْمَ وَالنُّبُوَّةَ ثُمَّ يَقُوْلَ لِلنَّاسِ كُوْنُوْا عِبَادًا لِّيْ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَلٰكِنْ كُوْنُوْا رَبّٰنِيّٖنَ ۔

کسی بشر کا یہ کام نہیں ہے کہ اللہ تو اسے کتاب اور حکم اور نبوت سے سرفراز کرے اور وہ لوگوں سے یہ کہے کہ تم خدا کی بجائے میرے بندے بن جاؤ۔ بلکہ وہ تو یہی کہے گا کہ تم ربانی بنو۔

وَلَا يَاْمُرَكُمْ اَنْ تَتَّخِذُوا الْمَلٰٓئِكَةَ وَالنَّبِيّٖنَ اَرْبَابًا

(خدا) یہ حکم نہیں دیتا کہ فرشتوں اور نبیوں کو خدا بناؤ

اسلامی حکومت اور تھیاکریسی کے اگر اس بنیادی فرق کو ذہن نشین کر لیا جائے تو باقی امور بڑی ہی آسانی سے حل ہو سکتے ہیں۔ اسلام جس حکومت کا تصور پیش کرتا ہے اس میں خداوند تعالیٰ کے اقتدار اعلیٰ کے تحت سارے مسلمانوں کو ایک محدود عمومی حاکمیت عطا کی گئی ہے۔ یہ حق کسی ایک گروہ کو تفویض نہیں کیا گیا۔ بلکہ ہر مسلمان اس زمین پر خدا کا نائب، شاہد علی الناس اور امر بالمعروف ونہی عن المنکر میں براہ راست خدا کے سامنے جواب دہ ہے۔ یہاں عامل صرف ایک فرد یا ایک گروہ کی رائے سے نہیں بلکہ سارے مسلمانوں کی رائے سے بنے گی۔ مسلمان ہی اس کو معزول کرنے کے مختار ہوں گے۔ سارے انتظامی معاملات اور وہ مسائل جن کے متعلق خدا کی شریعت میں کوئی صریح حکم موجود نہیں ہے۔ مسلمانوں کے اجماع ہی سے طے ہوں گے۔ اور الٰہی قانون جہاں تعبیر طلب ہوگا وہاں کوئی مخصوص طبقہ یا نسل نہیں بلکہ پوری ملت اسلامیہ میں سے ہر شخص خواہ اس کی دنیاوی حیثیت کچھ ہی ہو اس بات کا مستحق ہوگا کہ وہ اس میں اپنی رائے پیش کر سکے۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس امر کی کئی مقامات پر صراحت فرمائی ہے۔ ہم یہاں حضرت علیؓ سے ایک روایت نقل کرتے ہیں:۔

قلت یا رسول اللہ الامر ینزل بنا بعدك لم ینزل فیه قرآن ولم یسمع منك فیه شئ، قال اجمعوا العابدین امتی و اجعلوه بینکم شوریٰ ولا تقضوا برائی واحد (روح المعانی)

میں نے عرض کیا یا رسول اللہ! آپ کے بعد کوئی معاملہ ایسا پیش آجائے جس کے متعلق نہ قرآن میں کچھ اترا ہو اور نہ آپ سے کوئی بات سنی گئی ہو؟ فرمایا میری امت میں سے عبادت گزار لوگوں کو جمع کرو اور اسے آپس کے مشورے کے لیے رکھ دو اور کسی ایک شخص کی رائے پر فیصلہ نہ کرو۔

اس ضمن میں ایک بہت بڑی غلط فہمی کا ازالہ کر دینا بھی ضروری ہے۔ بعض لوگوں نے اس حکم سے کہ اسلامی ریاست میں سب مسلمان برابر ہیں اور تعبیر کا حق کسی خاص قوم، طبقہ یا گروہ کے لیے مخصوص نہیں، یہ نتیجہ اخذ کر لیا ہے کہ ہر کس و ناکس تعبیر احکام اور اجتہاد و استنباط کرنے کا پوری طرح مجاز ہے۔ اسلام بےشک کسی ایک فرد یا چند افراد کی اجارہ داری نہیں مگر اس حدیث نے اس بات کی بھی وضاحت

کردی ہے کہ کسی اجتہادی مسئلہ میں ہر شخص کی رائے بھی قابلِ قبول نہیں ہو سکتی۔ یہ کام اُنہی لوگوں کا ہے جو "عیادت" سزاوار ہوں۔ جب ہم یہ کہتے ہیں کہ تھیاکریسی کے برعکس اسلام میں کسی پریسٹ ہڈ کی گنجائش نہیں تو اس کا مطلب یہ ہے کہ اس دینِ حق میں کتاب و سنت کا علم نہ تو بنی اسرائیل کی طرح نسل اور قبیلے کی میراث ہے، نہ عیسائیوں کی طرح صرف پوپ اور پادریوں تک محدود ہے اور نہ ہی ہندوؤں کی طرح صرف برہمنوں کا آبائی حق ہے بلکہ یہاں ہر شخص اس پر وقت اور محنت صرف کر کے مسائلِ شریعت میں کلام کرنے کا مجاز ہو سکتا ہے۔ اسلام میں پریسٹ ہڈ اور برہمنیت" نہ ہونے کا اگر کوئی معقول مطلب ہے تو وہ یہی ہے۔ نہ یہ کہ اسلام کو کوئی بازیچۂ اطفال بنا کر چھوڑ دیا گیا ہے جس سے ہر شخص خواہ اُس کا علم کس قدر ناقص ہو، اس کا فکر کس قدر نارسا ہو، اور اُس کی زندگی تقوی سے کس قدر خالی ہو، کھیلتا پھرے۔ یہاں علم کے دروازے ہر اُس شخص پر کھلے ہیں جو اس کو حاصل کرنے کا خواہشمند ہو۔ ؎

جو بڑھ کر خود اُٹھا لے ہاتھ میں مینا اسی کا ہے

اس کے ساتھ یہ بات بھی ملحوظِ خاطر رہے کہ تھیاکریسی میں برسرِ اقتدار طبقہ عوام الناس سے غیر مشروط اطاعت کا مطالبہ کرتا ہے۔ جس بنیادی تخیل پر اس کی تعمیر ہوتی ہے وہ یہ ہے کہ حکمراں خدا کا نائب یا اس کا مظہر ہونے کی وجہ سے صرف اُسی کے سامنے ہی جوابدہ ہے۔ اس لیے لوگوں کو یہ حق نہیں پہنچتا کہ وہ اُس کے کسی قول یا فعل کے متعلق اُس سے کوئی باز پرس کر سکیں۔ اُن کا فرض صرف یہی ہے کہ وہ اقتدار کے مسند پر قابض ہونے والے لوگوں کی بلا چون و چرا اطاعت کرتے رہیں۔ اسلام نے اس کے برعکس اس امر کی بار بار صراحت فرمائی ہے کہ اسلامی ریاست میں اولی الامر اُس وقت تک لوگوں سے اطاعت کا مطالبہ کر سکتا ہے جب تک کہ وہ خود احکامِ خدا اور رسول کا پابند ہو۔ اور اگر وہ ان کی پابندی نہیں کرتا تو وہ اطاعت کا مستحق بھی نہیں ٹھہرتا۔ کیونکہ اُس کی اطاعت صرف اس لیے کی جاتی ہے کہ اس زمین میں خدا کی منشا کو پورا کرنے کے لیے جو نظام قائم کیا گیا ہے اُس کو چلانے کے لیے وہ سب سے زیادہ اہل ہے۔ اور اگر وہ اس بنیادی مقصد کو پورا نہیں کرتا تو اُس کی امارت بالکل بیکار ہے بلکہ سراسر ظلم اور ناانصافی ہے۔ قرآن اس باب میں صاف صاف کہتا ہے کہ:۔

وَلَا تُطِعْ مَنْ اَغْفَلْنَا قَلْبَهٗ عَنْ ذِكْرِنَا وَاتَّبَعَ هَوٰىهُ وَكَانَ اَمْرُهٗ فُرُطًا (الکہف)

اور کسی ایسے شخص کی اطاعت نہ کرجس کے دل کو ہم نے اپنی یاد سے غافل کردیا ہو اور جس نے اپنی خواہش نفس کی پیروی اختیار کر لی ہو اور جس کا امر حدود آشنا نہ ہو۔

وَلَا تُطِيْعُوْٓا اَمْرَ الْمُسْرِفِيْنَ الَّذِيْنَ يُفْسِدُوْنَ فِي الْاَرْضِ وَلَا يُصْلِحُوْنَ (الشعراء)

اور حد سے گزر جانے والوں کے امر کی اطاعت نہ کرو جو زمین میں بگاڑ پیدا کرتے ہیں اور اصلاح نہیں کرتے۔

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اس سے بھی زیادہ وضاحت کے ساتھ اس معاملے کو یوں فرماتے ہیں:۔

اَلسَّمْعُ والطاعۃُ علی المرءِ المسلمِ فی ما اَحَبَّ وکَرِہَ مالم یُؤمَرْ بمعصیۃٍ فاذا امر بمعصیۃٍ فلا سَمْعَ ولا طاعَۃَ

ایک مرد مسلمان پر سمع وطاعت لازم ہے خواہ برضاو رغبت، خواہ بکراہت، تاوقتیکہ اس کو معصیت کا حکم نہ دیا جائے۔ پھر اگر معصیت کا حکم دیا جائے تو نہ سمع ہے نہ طاعت۔

لاطاعۃ فی معصیۃ انما الطاعۃ فی المعروف

معصیت میں کوئی طاعت نہیں، طاعت صرف معروف میں ہے۔

اس طرح مختلف روایات سے یہ ثابت ہے کہ حضرات خلفا جب بھی لوگوں سے بیعت لیتے تو اس امر کی خود ہی صراحت فرما دیتے۔ چنانچہ حضرت ابوبکر صدیقؓ نے خلافت کا بار سنبھالتے ہوئے جن خیالات کا اظہار فرمایا وہ اسی کی تائید کرتے ہیں۔

ایھا الناس قد ولیت علیکم ولست بخیرکم فان احسنت فاعینونی وان اسأت فقوّمونی، الصدق امانۃ والکذب خیانۃ والضعیف فیکم قوی عندی حتی اخذ لہ حقہ والقوی ضعیف عندی حتی اخذ منہ الحق۔ اطیعونی فی ما اطعت اللہ و

اے لوگو! میں تمہارا ولی مقرر کیا گیا ہوں۔ میں تم سے بہتر نہیں ہوں۔ اگر میں بھلائی کروں تو مدد کرو۔ اگر میں برائی کروں تو مجھے تنبیہ کرو۔ سچائی امانت ہے اور جھوٹ خیانت۔ تم میں سے جو ضعیف ہے وہ میرے نزدیک قوی ہے۔ یہاں تک کہ اس کا حق دلوا دوں اور قوی ضعیف ہے یہاں تک کہ اس سے غریب کا

رسوله فاذا عصیت الله و رسوله فلا طاعة لی علیکم - | حق لوں - میری اطاعت کرو اس وقت تک جب تک میں اللہ اور رسول کی اطاعت کرتا ہوں - اگر میں اللہ اور رسول کی نافرمانی کروں تو میری اطاعت تم پر واجب نہیں -

حضرت شاہ ولی اللہ نے اپنی کتاب حجۃ اللہ البالغہ میں اسی اہم مسئلے پر اظہار خیال کرتے ہوئے فرمایا ہے

"امام اور خلیفہ کا تقرر انہی مصالح کے قیام و استحکام کے لیے ہے جن کی بدولت ملت بیضا اور تمدن کا نظام احسن طریقہ پر قائم رہ سکتا ہے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت انہی دو گونہ مصالح کے حصول کے لیے ہے - امام المسلمین یا خلیفۃ المسلمین آپ ہی کا نائب اور آپ کے احکام کے اجراء و تنفیذ کا ذریعہ ہے - اس لیے اُس کی اطاعت بعینہٖ رسول اکرم کی اطاعت ہے اور اس کی نافرمانی کرنا رسولِ خدا کے حکم کو نہ ماننے کے مترادف ہے - لیکن اگر وہ کسی ایسی بات کا حکم دے جس سے اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول کی نافرمانی ہوتی ہے تو ان دریں حالات وہ واجب الاطاعت نہیں -"

اسی سے یہ بات بھی مستنبط ہوتی ہے کہ اسلامی حکومت، مذہبی حکومت کی طرح اربابِ اختیار کو ایسے بلند مقامات عطا نہیں کرتی جو تنقید سے بالاتر ہوں - یہاں ہر صاحبِ امر اگر ایک طرف اپنے اعمال کے لیے خدا کے سامنے جواب دہ ہے تو دوسری طرف وہ خلافت کے نازک ترین فرائض کی بجا آوری کے لیے خلق کے سامنے بھی ماخوذ ہے - اسلام میں حکومت تھیاکریسی اور قسطائیت کی طرح کوئی غیر مسئول ادارہ نہیں کہ برسرِ اقتدار طبقے جو چاہیں کرتے پھریں اور کوئی اُن سے بازپرس کرنے کی جرأت نہ کرے - یہاں ہر حاکم کے افعال پر احتساب کیا جا سکتا ہے - خود خلفاء راشدین کا اپنا عمل یہ ظاہر کرتا ہے کہ خدا کے ان پاک بندوں نے نہ صرف تنقید کو برداشت کیا بلکہ اُس کا پوری طرح خیر مقدم بھی کیا - کیونکہ انہیں علم تھا کہ عوام کے اندر احتساب کی روح کا مردہ پڑ جانا پوری ملت کے لیے ایک عظیم خطرہ کا باعث ہو سکتا ہے - انہوں نے جب کبھی بھی یہ دیکھا کہ لوگ رسولِ خدا کے علاوہ کسی دوسرے انسان کو معیارِ حق بنا رہے ہیں، تو وہ فوراً چوکنے ہو گئے اور اس بیماری کو دور کرنے کی پوری کوشش کی - اُن کے اس احساس کا اندازہ اس ایک واقعہ

سے لگایا جا سکتا ہے کہ ایک مرتبہ لوگوں میں کچھ غلط فہمی پھیل گئی کہ آدمی پر صرف اس کے اپنے عمل کی ذمہ داری ہے۔ جماعت کے دوسرے لوگ جو چاہیں کرتے رہیں۔ ان کی برائی اور بھلائی سے متعلق خدا کے ہاں اس سے کوئی پرسش نہیں ہوگی۔ یہ لوگ قرآن پاک کی اس آیت سے دلیل پکڑتے تھے کہ "يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا عَلَيْكُمْ أَنْفُسَكُمْ، لَا يَضُرُّكُمْ مَنْ ضَلَّ إِذَا اهْتَدَيْتُمْ" (اے ایمان والو! تم اپنے آپ کو بچاؤ، جو لوگ گمراہ ہیں ان کی گمراہی تم کو کوئی نقصان نہیں پہنچائے گی جب کہ تم خود ہدایت پر ہو) حضرت ابوبکرؓ کو جب لوگوں کی اس غلط فہمی کی اطلاع ہوئی تو انہوں نے اس کو بڑی اہمیت کے ساتھ محسوس کیا اور خیال کیا کہ اگر یہ غلط فہمی عام ہو گئی تو امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کی وہ روح ہی لوگوں کے اندر مردہ ہو جائے گی جس کے بغیر اسلامی معاشرہ اور اسلامی نظام کا اپنی صحیح حالت پر قائم رہنا ناممکن ہے۔ چنانچہ انہوں نے خود اس غلط فہمی کو دور کرنے کے لیے لوگوں کے سامنے ایک تقریر میں فرمایا:-

"اے لوگو! تم اس آیت کا حوالہ دیتے ہو، يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا عَلَيْكُمْ أَنْفُسَكُمْ الآیہ اور ہم نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا ہے۔ آپ فرماتے تھے کہ لوگ جب برائی دیکھتے ہیں اور اس کی اصلاح نہیں کرتے تو بہت ممکن ہے کہ اس کے سبب سے جو عذاب آئے وہ سب کو اپنی لپیٹ میں لے لے۔" (کتاب الخراج)

تاریخ عالم کا کونسا ایسا طالب علم ہے جو حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے رعب و دبدبہ کو نہ جانتا ہو لیکن اس کے باوجود انہوں نے لوگوں کی تنقید کو نہایت ہی ٹھنڈے دل اور خندہ پیشانی کے ساتھ سنا بلکہ بعض مواقع پر اس کی حوصلہ افزائی فرمائی[2]۔

---

[1] بحوالہ حقیقت شرک از مولانا امین احسن اصلاحی۔

[2] چند سالوں کا ذکر ہے کہ پنجاب میں ایک صاحب نے جو فسطائیت سے مرعوب تھے، امیر کے احتساب پر شدید نکتہ چینی کی اور اپنے اس نظریہ کی تائید میں عجیب و غریب دلائل دیئے، اور یہاں تک بہکے کہ وہ مقدس انسان جس نے حضرت عمر فاروقؓ سے چادروں کی تقسیم کے متعلق استفسار کیا تھا اُس کے بارے میں "بدبخت" اور "کم بخت" جیسے نازیبا الفاظ کا استعمال کر ڈالا۔

یہ واقعات اتنے لاتعداد ہیں کہ ان سب کو ایک مستقل کتاب میں ہی سمیٹا جا سکتا ہے ہم یہاں صرف چند ہی نقل کرتے ہیں :-

"حضرت حسن بصریؒ سے روایت ہے کہ ایک شخص نے حضرت عمرؓ سے کہا، اے عمر! اللہ سے ڈر، اور اس جملہ کو بار بار دہرایا، ایک دوسرے شخص نے اس کو ٹوکا کہ اب بس بھی کرو، بہت ہو چکا حضرت عمرؓ نے فرمایا ان کو کہنے دو۔ اگر یہ ہمیں ایسی باتیں نہ کہیں تو ان میں کوئی خوبی نہیں اور اگر ہم ان کی نصیحتوں کو قبول نہ کریں تو ہم میں کوئی خوبی نہیں" (کتاب الخراج)

ایک دفعہ رعایا کے حقوق و فرائض کی تشریح کرتے ہوئے فرمایا :-

"اور تم میرے نفس کے مقابلہ میں میری مدد اس طرح کر سکتے ہو کہ مجھے بھلائی کا حکم دو اور برائی سے روکو، نیز خدا نے تمہاری جو ذمہ داری مجھ پر ڈالی ہے۔ اس کے بارہ میں میری خیر خواہی یہی ہے کہ مجھے نصیحت کرتے رہو" (کتاب الخراج)

اسی طرح حضرت عمرؒ بن عبد العزیز نے ارشاد فرمایا :-

"اللہ تعالیٰ خواص کی بدکاریوں کی پاداش میں عوام کو نہیں پکڑتا مگر جب برائیاں کھلم کھلا ہونے لگتی ہیں اور ان کے خلاف آواز نہیں اٹھتی تو سب سزا کے مستحق قرار پاتے ہیں" (کتاب الخراج)

خلفاء راشدین کے اسی خدا پرستانہ طرزِ عمل کا نتیجہ تھا کہ ایک معمولی سے معمولی بدو اور غریب سے غریب بڑھیا برسرِ عام حضرت عمرؓ جیسے جلیل القدر خلیفہ سے بغیر کسی خوف کے باز پرس کرتے ہیں۔ اُن سے پوچھتے ہیں کہ اے عمرؓ تم نے یہ کیوں کیا۔

اس قبیل کے واقعات سے تاریخ بھری پڑی ہے۔ اور یہ سب اس بات کی قوی دلیل ہیں کہ اسلامی حکومت میں تھیاکریسی کی طرح اختلاف اقتدار کے سامنے دم بخود نہیں ہوتا، تنقید اس کے روبرو مہر بہ لب نہیں رہتی بلکہ عوام کو اس بات کا پورا حق حاصل ہوتا ہے کہ وہ خلیفہ کے پرائیویٹ سے پرائیویٹ معاملہ پر بھی اگر ضرورت پیش آئے تو بلا تامل اور بے دریغ حرف گیری کریں۔

تھیاکریسی جن نظریات کے سہارے زندہ رہی ان میں ایک نسلی اور نسبی فضیلتوں کا عقیدہ بھی ہے۔

ہندوستان کے قدیم برہمن اور یہود اور نصاریٰ کے مذہبی پیشوا ایک مدت تک مرجع خلائق بننے اور امن و فارغ البالی کی زندگی میسر آنے کی وجہ سے اس خبط میں مبتلا ہو چکے تھے کہ یہ اُن کا پیدائشی حق ہے۔ وہ خدا کے سب سے زیادہ عزیز اور محبوب بندے ہیں اور اس لیے یہ عزت، یہ سیادت، یہ سربراہی اُن کا لازمی حصہ ہے جو کبھی ان سے منفک نہیں ہو سکتا۔ قرآن حکیم اُن کے ان دعووں کو سراسر باطل قرار دیتا ہے۔

سورۂ مائدہ میں ہے :۔

وَقَالَتِ الْيَهُودُ وَالنَّصٰرٰى نَحْنُ اَبْنٰٓؤُا اللّٰهِ وَاَحِبَّآؤُهٗ ۔ قُلْ فَلِمَ يُعَذِّبُكُمْ بِذُنُوْبِكُمْ بَلْ اَنْتُمْ بَشَرٌ مِّمَّنْ خَلَقَ يَغْفِرُ لِمَنْ يَّشَآءُ وَيُعَذِّبُ مَنْ يَّشَآءُ

اور یہود و نصاریٰ کہتے ہیں ہم اللہ کے بیٹے اور اس کے دوست ہیں۔ پوچھو پھر خدا تمہیں گناہوں کے بدلے میں سزا کیوں دیتا ہے بلکہ تم بھی خدا کی مخلوق کے عام آدمیوں کی طرح ہو وہ بخشے گا جس کو چاہے اور سزا دے گا جس کو چاہے۔

اسلامی حکومت میں شرافت اور بزرگی کا معیار کسی خاص قبیلہ اور گروہ سے تعلق نہیں بلکہ تقویٰ اور پرہیزگاری ہے۔ قرآن حکیم نے اِنَّ اَكْرَمَكُمْ عِنْدَ اللّٰهِ اَتْقٰكُمْ کہہ کر صرف انسانی اعمال کو شرف و احترام کا مستحق ٹھہرایا ہے۔ فتح مکہ کے موقع پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے نسل و نسب کے تفاخر کو جو تھیاکریسی کی جان ہے یہ کہہ کر ختم کر دیا۔

یا معشر قریش ان اللہ قد اذھب عنکم نخوۃ الجاھلیۃ وتعظمھا بالآباء الناس من آدم وآدم من تراب (ابن ہشام)

اے قریش کے لوگو! اب جاہلیت کا غرور اور نسب کا فخر خدا نے مٹا دیا ہے، تمام انسان آدم کی نسل ہیں اور آدمی مٹی سے بنے ہیں۔

حجۃ الوداع کے مجمع میں پھر اعلان فرمایا :۔

لیس للعربی فضل علی العجمی ولا للعجمی فضل علی العربی، کلکم ابناء آدم وآدم من تراب۔

عرب کو عجم اور عجم کو عرب پر کوئی فضیلت نہیں ہے، تم سب کے سب آدم کے بیٹے ہو اور آدم مٹی سے بنے تھے[1]

[1] حدیث شریف میں ہے لا تاتونی بانسابکم واتونی باعمالکم (میرے سامنے نسب نہ لاؤ، عمل لاؤ) اور (باقی ص ۲۰۳ پر)

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اپنے ایک سپہ سالار کو ضروری ہدایت دیتے ہوئے اس اصول کی طرف ان الفاظ میں توجہ دلائی۔

لیس بین اللہ و بین احد نسب	اللہ اور کسی شخص کے درمیان کوئی رشتہ نہیں ہے مگر
الا بطاعۃ فالناس شریفھم و وضیعھم	اس کی اطاعت کے واسطہ سے اس وجہ سے خدا
فی دین اللہ سواء۔	کے قانون میں شریف اور حقیر سب برابر ہیں۔

عدل و انصاف کے یہ سنہری اصول صرف قول و اقرار تک ہی محدود نہ تھے بلکہ زمانہ اس بات پر گواہ ہے کہ انہیں دنیا میں نافذ بھی کیا گیا۔ ان کے ذریعہ دنیا بھر کی سطوت و خدائی ختم ہوئی اور اس زمین پر صرف ایک خدا کے تخت کو بچھایا گیا۔ پندار و غرور نے الوہیت و خدائی کی جتنی صورتیں اختیار کر رکھی تھیں ان سے انسان کو نجات نصیب ہوئی اور نسل، قوم کے نام پر انسانی خواہشات و آرزوؤں کے جتنے صنم خانے آباد تھے انہیں نیست و نابود کر دیا گیا۔ اگر اس کائنات کے حافظہ میں نسبی برتری اور تفوق کے چند روح فرسا واقعات محفوظ ہیں تو اسی کائنات کے لیل و نہار کی سلوٹوں میں آج ہمیں ایک ایسا روشن دور بھی ملتا ہے جس میں امیر و غریب، حاکم و محکوم کے سارے مصنوعی اختلافات حرف غلط کی طرح مٹا دیئے گئے۔ یہ اسی "دور سعید" کا اعجاز تھا کہ محمود و ایاز صرف مسجد میں ہی نہیں بلکہ زندگی کے ہر میدان میں ایک ہی صف میں کھڑے کر دیئے گئے۔ کہاں یہ ظلم کہ کوئی نیچ ذات کا انسان اونچ ذات کے انسان کی طرف نگاہ اٹھا کر دیکھنے کی بھی جرأت نہ کرتا اور کہاں یہ انصاف کہ ایک معمولی سے معمولی شخص بھی اپنے وقت کے خلیفہ، اور سب سے زیادہ با اختیار انسان کو عدالت کے

(بقیہ حاشیہ ۱۹۹) حضرت علی کرم اللہ وجہہ کی طرف یہ شعر منسوب ہے ؎

انا بن نفسی و کنیتی ادبی	من عجم کنت او من العرب
ان الفتیٰ من یقول ھا انا اذا	لیس الفتیٰ من یقول ابی

میں اپنے نفس کا بیٹا ہوں اور کنیت میرا ادب ہے نسب عجمی ہو یا عربی مردود ہے۔ جوان وہ ہے جو اپنی ذات کو پیش کرے، نہ کہ وہ جو باپ کا نام پیش کرے۔

کٹہرے میں بلوانے کا مجاز ٹھہرا۔ ایک خلیفہ کا تو ذکر ہی کیا خود نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے لیے قانون کے معاملہ میں کوئی رعایت طلب نہیں کی۔

ایک مرتبہ قریش کے ایک معزز گھرانے کی ایک عورت نے چوری کی۔ چوری کی سزا اسلام میں ہاتھ کاٹ دینا ہے بعض لوگوں نے اس عورت کی خاندانی عظمت کے پیش نظر اس کے لیے قانون میں کچھ رعایت حاصل کرنا چاہی۔ چنانچہ اسامہؓ بن زید سے، جو آنحضرت کو نہایت ہی محبوب تھے درخواست کی گئی کہ وہ اس عورت کے بارہ میں آپ سے سفارش کریں۔ انہوں نے لوگوں کے اصرار سے مجبور ہو کر آنحضرت سے سفارش کی۔ آپ نے اُن کی اس حرکت پر سخت ناپسندیدگی کا اظہار فرمایا۔ پھر لوگوں کے سامنے ایک خطبہ دیا اور فرمایا کہ تم سے پہلے بہت سی قومیں اس وجہ سے ہلاک ہوئیں کہ جب ان میں کوئی معمولی آدمی ارتکاب جرم کرتا تو اسے سزا دیتے مگر جب کوئی باثر آدمی یہ حرکت کرتا تو اس سے درگذر کرتے۔ اس کے بعد نہایت ہی زور کے ساتھ یہ فرمایا:۔

والذی نفس محمد بیدہ لو سرقت فاطمۃ بنت محمد لقطعت یدھا	اس ذات کی قسم جس کی مٹھی میں محمدؐ کی جان ہے اگر فاطمہؓ بنت محمد نے چوری کی ہوتی تو میں اس کا ہاتھ بھی ضرور کاٹ دیتا۔

اس بے لاگ عدل کی ایک دوسری مثال بھی ملاحظہ ہو:۔

"عمرو بن عاص مصر کے فاتح بھی تھے اور وہاں کے گورنر بھی تھے۔ اُن کے بیٹے محمد کا قصہ ہے کہ اس نے ایک مصری کو کوڑے مارے اور مارتے ہوئے یہ کہا "کہ یہ لے، میں ایک بڑے باپ کا بیٹا ہوں" عمرو بن عاص نے مصری کی داد رسی کرنے کی بجائے اُلٹے اس کو گرفتار کر لیا کہ کہیں مدینہ جا کر امیرالمومنین سے شکایت نہ کر دے۔ مصری کچھ مدت کے بعد جب رہا ہوا تو سیدھے مدینہ پہنچا اور اس ظلم کی شکایت حضرت عمرؓ سے کی۔ حضرت عمرؓ نے مصری کو اپنے پاس روک لیا اور عمرو بن عاص اور ان کے بیٹے کو مصر سے طلب فرمایا۔ دونوں مجلس قصاص میں حاضر کئے گئے۔ اس کے بعد حضرت عمرؓ نے مصری کو بلایا اور اس کے ہاتھ میں کوڑا دے کر فرمایا" یہ لے

اور پہلے اس سے بڑے باپ کے بیٹے کی خبر لے" مصری نے محمد کو مارا اور لہولہان کر دیا۔ اور اس دوران میں حضرت عمر برابر فرماتے رہے کہ "ہاں مار اس بڑے باپ کے بیٹے کو۔" جب مصری مار چکا اور کوڑا حضرت عمر کو واپس کرنے لگا تو حضرت عمرؓ نے اس سے فرمایا "کہ ایک آدھ عمرو بن عاص کی چندیا پر رسید کر کیونکہ انہی کے بل پر ان کے برخوردار نے تجھے کوڑے مارنے کی جرأت کی، عمرو بن عاص نے عرض کی امیر المومنین! انصاف کا حق ادا ہو گیا، مصری نے بھی کہا کہ امیر المومنین میرے ساتھ جس نے زیادتی کی تھی میں نے اس سے بدلہ لے لیا۔ اب کسی اور سے بدلہ لینے کا خواہشمند نہیں ہوں۔ حضرت عمرؓ نے فرمایا تجھے اختیار ہے ورنہ اگر تو ان کو بھی مارتا تو میں ان کے اور تیرے درمیان حائل ہونے والا نہیں تھا یہاں تک کہ تو خود ان کو چھوڑ دیتا۔ اس کے بعد عمرو بن عاص کی طرف نہایت غضبناک انداز میں دیکھ کر بولے "عمرو! تم نے لوگوں کو کب سے غلام بنایا ہے، حالانکہ ان کی ماؤں نے ان کو آزاد جنا تھا[1]۔"

دنیا کے اس جلیل القدر انسان نے اپنی قوت و جبروت کے باوجود جس احسن طریقہ سے اپنے آپ کو ایک عام مسلمان کی سطح پر زندہ رکھا۔ اس کی مثال "مذہبی حکومت" میں تو کیا دورِ جدید کی کسی متمدن سے متمدن حکومت میں بھی نہیں ملتی۔ اپنی درماندگی کا اعتراف کرتے ہوئے انہوں نے ایک دفعہ فرمایا:-

میں ایک عام مسلمان اور کمزور بندہ ہوں۔ صرف اللہ تعالیٰ کی مدد کا مجھے بھروسہ ہے میں جس منصب پر متمکن کیا گیا ہوں۔ انشاء اللہ وہ میری طبیعت میں ذرہ برابر بھی تغیر پیدا نہیں کر سکے گا۔ بزرگی اور بڑائی جتنی کچھ بھی ہے سب اللہ کے لیے ہے، بندوں کے لیے اس میں کوئی حصہ نہیں ہے۔ تم میں سے کسی کو یہ کہنے کا موقع نہیں ملے گا کہ عمر خلیفہ بن کے کچھ سے کچھ ہو گیا ہے۔ میں اپنی ذات سے بھی حق وصول کر لوں گا اور جس معاملہ میں ضرورت ہو گی خود بڑھ کر صفائی پیش کر دوں گا۔ جس شخص کو کوئی ضرورت ہو یا جس پر کوئی ظلم ہوا ہو، یا جو شخص میری کسی بات پر نکتہ چینی کرنا چاہتا ہو، وہ براہ راست میرے پاس آئے میں تمہارے ہی

---

[1] بحوالہ حقیقت شرک از مولانا امین احسن صاحب اصلاحی

اندر کا ایک آدمی ہوں۔ تمہاری بہبود مجھے عزیز ہے۔ تمہاری خفگی مجھ پر گراں ہے۔"

باطل پرست عربوں کو حضور سرورِ دو عالم کے جس کام کا سب سے زیادہ شکوہ تھا وہ یہی کہ آپ کی تعلیم سے مساوات و اخوت کے اصول مستحکم ہوتے ہیں اور نسلی شرافت و فضیلت کے تصور کو صدمہ پہنچتا ہے۔

چنانچہ ابوجہل اسی چیز پر سب سے زیادہ برافروختہ تھا۔ اور غضبناک ہو کر کہتا ؎

مذہب او قاطع ملک و نسب
از قریش و منکر از فضل عرب
در نگاہ او یکے بالا و پست
با غلام خویش بر یک خواں نشست
احمراں با اسوداں آمیختند
آبروئے دودمانے ریختند

(باقی آئندہ)

لہ الفاروق عمر بحوالہ اسلامی ریاست از مولانا امین احسن اصلاحی

رسائل و مسائل

اقامتِ دین کے بارے میں چند ذہنی اشکالات

سوال۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد خلافت کی ذمہ داریاں جن جلیل القدر صحابہ کے کاندھوں پر ڈالی گئیں ان کے بارے میں بلاخوف تردید کہا جا سکتا ہے کہ وہ نوع انسانیت کے گل سرسبد تھے لیکن اس کے باوجود اس تاریخی حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ خلافت راشدہ کا نظام جلد درہم برہم ہو گیا اور جنگ جمل و جنگ صفین جیسے حادثات رونما ہوئے جن کا اسلامی تحریک کے ارتقاء پر ناخوشگوار اثر پڑا۔ ان حالات سے پیدا شدہ چند سوالات ذہن میں پیدا ہوتے ہیں جن کے جوابات مطلوب ہیں۔ سوالات حسب ذیل ہیں۔

(۱) نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے اتنے قریبی زمانے میں اور عہد نبوی میں تربیت یافتہ صحابہ کی موجودگی میں اگر مسلم سوسائٹی میں خلفشار پیدا ہو سکتا ہے تو آج ہم لوگ جو ان سلف صالحین کی بلندیوں کے تصور سے بھی عاجز ہیں، کس چیز پر فخر کر سکتے ہیں اور کیسے یہ دعویٰ کر سکتے ہیں کہ ہم ایک مکمل اسلامی ریاست قائم کر سکیں گے؟

(۲) اگر یہ کہا جائے کہ اسلام اس تیز رفتاری سے پھیل رہا تھا کہ اس مناسبت سے اس میں داخل اور شامل ہونے والوں کی تربیت کا انتظام نہیں ہو سکتا تھا تو اس پر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ خلفاء اسلام نے نظام اسلامی اور مسلم معاشرہ کو پورے طور پر استوار اور مستحکم (CONSOLIDATE) کیے بغیر اس کی توسیع (EXPANSION) کیوں ہونے دی؟

(۳) اگر ہمارے پیشرو لغزشوں سے محفوظ نہیں رہ سکے تو ہمارا دامن کیسے پاک رہ سکتا ہے اور اقامت دین کے لیے ہم میں جرأت عمل کیسے پیدا ہو سکتی ہے؟

جواب :- آپ کے سوالات جتنے آسان اور مختصر معلوم ہوتے ہیں ان کا جواب اتنے اختصار اور آسانی سے دینا محال ہے۔ ان مسائل پر مفصل بحث سر دست مشکل ہے صرف مجمل جوابی اشارات عرض ہیں۔ اللہ نے چاہا تو انہی سے آپ کی تشفی ہو جائے گی۔

(۱) اپنی قومی تاریخ میں ہمیں محض دھبوں ہی کی تلاش نہیں کرنی چاہیے اور صرف اُن ہی کے تصور پر شرما کر نہیں رہ جانا چاہیے۔ ہماری تاریخ بہت سے روشن نشانات کی بھی حامل ہے۔ ہمیں اُن پر بھی فخر کرنا چاہیے اور انہیں نگاہ میں رکھ کر امید اور اعتماد کے ساتھ آگے بڑھنا چاہیے۔ روشن نشانات کو دیکھنے سے گریز کرنا اور صرف دھبوں کا خیال کر کے دل مسوس کر بیٹھ جانا بہت بیجا قسم کی قنوطیت ہے۔

(۲) توسیع اور استحکام کے درمیان توازن و تناسب ذہنی دنیا میں تو قائم کیا جا سکتا ہے مگر عملی دنیا میں یہ ممکن نہیں ہے۔ ایک شخص اگر آپ کے پاس شرک یا کفر سے توبہ کرنے کے لیے آئے تو آخر کس عذر کی بنا پر آپ اُسے اُلٹا واپس کر دیں گے؟ کیا آپ اُس سے یہ کہیں گے کہ اِس وقت میں استحکام میں مصروف ہوں اور توسیع کا کام میں نے فی الحال بند کر رکھا ہے؟

(۳) انسان جب تک انسان ہے اُس کی سعی بشریت کے تقاضوں اور محدودیتوں سے پاک نہیں ہو سکتی۔ ہر شخص کو اپنی حد تک اپنا فرض بہتر سے بہتر طریقہ سے انجام دینے کی کوشش کرنی چاہیے اور ساتھ ہی ساتھ اللہ سے دعا کرتے رہنا چاہیے کہ وہ ہمیں ارادی لغزشوں سے بچائے اور غیر ارادی لغزشوں کو معاف فرمائے۔

قرعہ اور لاٹری

سوال :- ہمارے دفتر کا یہ ایک پرانا ضابطہ ہے کہ جو شخص بھی اس دفتر سے ایک میل کی دوری پر رہتا ہے، اور یہاں کام کرتا ہے، اُسے دفتر کی سائیکل آمد و رفت کے لیے دی جاتی ہے۔ دفتر میں ایک ہی سائیکل ہے اور اتفاق سے اس وقت دفتر کے پانچ ملازم ایسے ہیں جو

قریب قریب سب کے سب ایک ایک میل کے فاصلے پر رہتے ہیں۔ ہمارے افسر متعلقہ کا خیال ہے کہ قرعہ ڈال کر کسی ایک صاحب کو انتخاب کر لیا جائے، کیونکہ اس کے سوا چارہ نہیں ہے۔ میرے خیال میں قرعہ بھی جوئے اور لاٹری کی تعریف میں آتا ہے جو کہ شرعاً ناجائز ہے۔ آپ فرمائیں آیا ایسا کرنا درست ہے؟

جواب۔ آپ نے جس قرعے کا ذکر فرمایا ہے اس پر لاٹری یا جوئے کا اطلاق نہیں ہوتا۔ قرعہ اور لاٹری دو مختلف چیزیں ہیں۔ لاٹری کی اکثر شکلیں بالعموم جوئے کے حکم میں آتی ہیں اور وہ شرعاً ناجائز ہیں۔ لیکن قرعہ شرعاً قابلِ اعتراض نہیں ہے۔ مجرد قرعہ لاٹری سے بالکل ایک الگ شے ہے جسے بعض ناگزیر صورتوں میں اختیار کیا جاتا ہے۔ دونوں میں اہم اور اصولی امتیاز یہ ہے کہ لاٹری میں کوئی حقیقی مجبوری یا الجھن درپیش نہیں ہوتی جو قدرتی طور پر رونما ہو گئی ہو اور جسے حل کرنا مقصود ہو بلکہ ایک پیشگی منصوبے اور سمجھوتے کے تحت پہلے شرکاء و منتظمین اپنے اپنے متوقع مفاد کی خاطر سرمایہ جمع کرتے ہیں اور پھر اس کی تقسیم کے لیے قصداً ایسے طریقے اختیار کیے جاتے ہیں جن کا بالعموم ایک حد تک انحصار بخت و اتفاق (GAME OF CHANCE) پر ہوتا ہے۔ اس کے نتیجے میں کچھ افراد کے پاس بلا وجہ اور بلا ضرورت اپنی محنت و ذہانت کے بالمقابل تناسب سے کہیں زیادہ سرمایہ چلا جاتا ہے اور لالچ میں آکر حصہ لینے والے بے شمار اشخاص محروم رہتے یا نقصان اٹھاتے ہیں۔ اس طرح کی تمام بازیوں کے داعی اور منتظم حضرات اپنی گرہ سے کسی کو کچھ نہیں دیتے اور نہ ہی کسی ایسی دولت کی تقسیم کرتے ہیں جو فراہم تو فطری طریق پر ہو گئی ہو اور اب صرف اس کے بانٹنے کا مسئلہ درپیش ہو۔ بلکہ وہ شرکت کرنے والوں سے ہی وصول کر کے کچھ ناجائز طور پر خود کھاتے ہیں اور کچھ دوسروں کو کھلاتے ہیں۔ برعکس اس کے قرعہ یا تو ایسی صورت میں ڈالا جاتا ہے جبکہ ایک خاص تعداد کے برابر کے حصے موجود ہوں اور انہیں اتنی ہی تعداد کے حق داروں میں تقسیم کرنا مقصود ہو۔ ایسی حالت میں بجائے اس کے کہ حصہ دار یا حصے بانٹنے والا خود حصے تقسیم کرے، قرعہ سے مدد لے کر ہر حصہ دار کو ایک حصہ دے دیا جاتا ہے۔ اس میں ناانصافی یا جانب داری کے کسی شائبہ کا امکان نہیں رہتا۔ دوسری صورت میں قرعہ اندازی کی حاجت اس طرح لاحق ہوتی ہے کہ قابلِ تفویض شے واحد اور

ناقابلِ تقسیم ہوتی ہے اور اُس کے مستحق ایک سے زائد یکساں طور پر ہوتے ہیں۔ ایسی صورت میں اگر سب کو محروم رکھا جائے تو یہ سب کے ساتھ ناانصافی ہے اور اگر دینے والا اپنی طرف سے کسی ایک کا انتخاب کرنا چاہے تو اس کے پاس کوئی وجہِ امتیاز نہیں ہوتی اور ایک کے علاوہ سب کی دل شکنی بھی ہوتی ہے۔ اس الجھن کا حل سوائے اس کے اور کیا ہو سکتا ہے کہ قرعہ ڈال کر کسی ایک کا نام نکال لیا جائے اور اسی کے سپرد وہ چیز کر دی جائے۔ ظاہر ہے کہ قرعہ کی ان دو شکلوں اور لاٹری کی مختلف شکلوں میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔ اور دونوں کے لیے ایک حکم نہیں ہو سکتا۔ لاٹری میں متعدد افراد کا پیسہ اس طرح جمع کیا اور بانٹا جاتا ہے کہ جس سے کسی فریق کی حق تلفی اور کسی کو ناروا فائدہ ہوتا ہے۔ اس کے برخلاف قرعہ کے ذریعے سے ایک واقعی پیش آمدہ الجھن کا ایک ایسا حل تلاش کیا جاتا ہے جس کے علاوہ کوئی دوسرا حل عملاً ممکن نہیں ہے۔

قرآن و حدیث میں جوئے اور قمار کی جن شکلوں کو ممنوع یا مکروہ قرار دیا گیا ہے، اُن میں سے کسی کا بھی اطلاق قرعہ پر نہیں ہوتا بلکہ متعدد احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ نے مختلف مواقع پر قرعہ کی مذکورہ بالا صورتوں کو اختیار فرمایا ہے۔ مستند روایات سے ثابت ہے کہ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کا جب تک مدینے میں قیام رہتا تھا تو آپ ازواجِ مطہرات کے لیے باریاں مقرر فرماتے تھے لیکن جب آپ سفر پر تشریف لے جاتے تھے تو قرعہ اندازی سے مدد لے کر آپ کسی ایک ام المومنین کا نام انتخاب فرماتے تھے اور پھر انہی کو ہمراہ لے جایا کرتے تھے۔

اس میں شک نہیں کہ مختلف کھیل اور کاروبار جن میں جوئے کی آمیزش ہوتی ہے، اُن میں بھی بعض مراحل پر قرعے ڈالے جاتے ہیں، لیکن ظاہر ہے کہ اس کی نوعیت سادہ قرعہ اندازی سے بالکل مختلف ہے۔ یہ جوا بازی کے اجزا میں سے ایک جز ہے، اور اپنے کل کے ساتھ یہ جز بھی ناجائز اور حرام ہے۔

امدادی کمیٹیاں

سوال:۔ آج کل ایک امدادی اسکیم کے تحت بعض تجارتی کمیٹیاں بنانے کا رواج ہے۔ مثال کے

طور پر چند افراد میں سے ہر شخص پانچ روپے ماہانہ چندہ دیتا ہے اور ہر ماہ کسی ایک آدمی کو پانسو روپے دیئے جاتے ہیں۔ اس طرح ہر آدمی پانچ روپے، دس روپے، پندرہ روپے یا زائد دے کر پانچ صد روپیہ حاصل کر لیتا ہے اور خسارہ کسی آدمی کو نہیں ہوتا۔ البتہ پانچ صد روپے کے عوض میں ہر پہلے لینے والے آدمی کو بعد میں لینے والے سے پانچ روپے کم ادا کرنے پڑتے ہیں۔ کمیٹی کا جمع شدہ سرمایہ تجارت میں لگا رہتا ہے جس سے منافع ہوتا ہے اور اسی منافع سے وہ زائد رقم فراہم ہوتی ہے جو ہر حصہ دار کو اپنے ادا کردہ چندہ سے زائد ملتی ہے۔ براہ کرم ان کمیٹیوں کے شرعی جواز و عدم جواز پر روشنی ڈالیں۔"

جواب:۔ جن کمیٹیوں کے بارے میں آپ نے دریافت فرمایا ہے اُن سے متعلق آپ کا بیان صاف، واضح اور مفصل نہیں ہے۔ تاہم آپ نے چونکہ پتہ نہیں لکھا اور جواب کے لیے اصرار فرمایا ہے اس لیے مزید وضاحت چاہے بغیر مختصر اصولی جواب دیا جا رہا ہے۔

جس طرح کی کمیٹیوں کا ذکر آپ نے کیا ہے اس طرح کی کمیٹیوں کی کچھ تفصیلات پہلے بھی ہمارے علم میں آئی ہیں۔ ان سب کو نگاہ میں رکھتے ہوئے ہمارا خیال یہ ہے کہ ان نام نہاد امدادی یا تجارتی کمیٹیوں کا کاروبار شک و شبہ سے بالاتر نہیں ہے، بلکہ ان میں ربٰو اور قمار کے اجزا کی آمیزش بالکل نمایاں ہے۔ یہ صورت کسی طرح جائز یا قرینِ انصاف نہیں ہو سکتی کہ مختلف حصہ داروں سے مختلف تعداد میں رقوم وصول کر لی جائیں، جمع شدہ سرمایہ کو تجارت میں لگا دیا جائے اور پھر نفع و نقصان یا ہر حصہ دار کی ادا کردہ رقم کا لحاظ کیے بغیر اُسے ایک مقرر رقم ادا کر دی جائے؟ آخر ایک متعین میعاد کے بعد جمع شدہ سرمایہ کو نفع یا نقصان کے ساتھ جملہ حصہ داروں میں حصص کے تناسب کے ساتھ کیوں نہ تقسیم کیا جائے؟ ایسا کیے بغیر ان کمیٹیوں کا کاروبار بہت ہی مشتبہ ہو جاتا ہے اور اسے سود اور جوئے کے شائبے سے بری قرار نہیں دیا جا سکتا۔ اور حضرت عمرؓ کے قول "فاجتنبوا الربٰو والریبۃ"[1] کے بموجب اس طرح کے معاملات

---

[1] اس کے معنی یہ ہیں کہ "پس سود اور مشتبہ معاملات سے بچو"۔ یہ الفاظ دراصل حضرت عمرؓ کے اُس ارشاد کا آخری جزو ہیں جس میں آپ نے بیان فرمایا تھا کہ سود کے آخری احکام کی وضاحت سے قبل نبی صلعم کا وصال ہو گیا۔ اس لیے تم سود کو بھی چھوڑ دو اور اُس چیز کو بھی جس میں سود کا شبہ ہو۔

سے اجتناب لازمی ہے۔

دراصل امدادی کمیٹی کی وہ ابتدائی اور سیدھی سادی شکل ہی سب سے زیادہ محفوظ اور جملہ اشتباہات سے پاک ہے جو مدت سے غربا اور متوسط طبقے کی آبادیوں اور محلوں میں رائج ہے۔ اس میں ایسا ہوتا ہے کہ مثلاً بارہ آدمی ہر ماہ دس دس روپے چندہ دیتے ہیں اور ہر ماہ کسی ایک حاجت مند کو جمع شدہ رقم دے دی جاتی ہے۔ اس طرح سال میں ایک مرتبہ ہر آدمی یک مشت اتنی رقم وصول کر لیتا ہے جتنی کہ وہ سال بھر میں بالاقساط ادا کرتا ہے۔ اس اسکیم کی ایک جائز اور ترقی یافتہ صورت یہ ہو سکتی ہے کہ ماہانہ چندے کے دو حصے کر لیے جائیں۔ ایک حصہ ہر ماہ جمع ہو کر کسی نہ کسی ضرورت مند کو باری باری سے دیا جاتا ہے اور دوسرا حصہ مجتمع ہو کر امداد باہمی کے اصول پہ تجارت میں لگتا رہے۔ سال کے آخر میں نفع و نقصان شمار کر لینے کے بعد یہ دوسرا حصہ بھی حصہ داروں میں تقسیم ہو جائے۔ ان شکلوں کے علاوہ اگر اور ایسی شکلیں ممکن ہوں، جن میں فریب اور حق تلفی کے خدشات نہ ہوں اور جو جوئے اور سود کی آلائشوں سے آلودہ نہ ہوں تو انہیں بھی اختیار کیا جا سکتا ہے۔ مگر ان کمیٹیوں کی ایسی "ترقی پسندانہ" صورتیں جو بظاہر میں تجارت مگر حقیقت میں "جوا" ہوں ایک مسلمان کے لیے قطعاً جائز نہیں کہلا سکتیں۔ ہو سکتا ہے کہ اس میں بظاہر ہر حصہ دار کو اپنے لیے "منافع" نظر آئے لیکن درحقیقت یہ سب کے لیے خسارے کا ہی سودا ہے۔

حُرمتِ رضاع

سوال۔ دو بھائی ہیں۔ بڑے کے ہاں ایک خاص مہینے بچہ پیدا ہوا۔ اور چھوٹے کے ہاں اس سے اگلے مہینے میں ایک لڑکا ہوا۔ بڑے بھائی کے لڑکے نے اپنی چچی کا دودھ پیدائش سے دو ماہ کے اندر پیا۔ چھوٹے بھائی کے ہاں اسی بیوی سے تین بچے اور ہوئے اور چوتھی مرتبہ آٹھ سال بعد بچی پیدا ہوئی۔ اب دریافت طلب امر یہ ہے کہ یہ آخری لڑکی بڑے بھائی کے

اُس لڑکے کے نکاح میں آسکتی ہے یا نہیں جس نے آٹھ سال پہلے اپنی چچی (لڑکی کی والدہ) کا دودھ پیا تھا۔ اس جگہ دو تین مثالیں ایسی نظر آئیں جن میں ایسی صورت میں نکاح ہوئے ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ صرف ایک ساتھ دُودھ پینے والے بچے رشتۂ مناکحت میں نہیں آسکتے۔ دوسرے بچے جو آگے پیچھے پیدا ہوں وہ آپس میں بیاہے جاسکتے ہیں۔

جواب - ایک لڑکا جب کسی عورت کا دُودھ پی لیتا ہے تو وہ عورت اُس لڑکے کی رضاعی ماں بن جاتی ہے اور اس رضاعی ماں کی ساری لڑکیاں اُس لڑکے کی رضاعی بہنیں بن جاتی ہیں۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ یحرم من الرضاع ما یحرم من النسب۔ یعنی جو رشتے ازروئے نسب حرام ہیں وہی رشتے اگر رضاعت کے تعلق سے قائم ہو جائیں تو وہ بھی حرام ہو جاتے ہیں چنانچہ ایک شخص کے لیے ساری رضاعی بہنیں بالکل اُسی طرح حرام ہونگی جس طرح ساری نسبی بہنیں۔ جس طرح نسبی بہن صرف وہ نہیں ہوتی جو بھائی کے ساتھ جڑواں پیدا ہو کر اس کے ہمراہ دُودھ پیے بلکہ تمام ماں جائی بہنیں نسب کے لحاظ سے بہنیں ہی ہیں، بالکل اُسی طرح رضاعی بہن صرف وہ نہیں ہے جس کے ساتھ سن رضاعت میں دُودھ پیا جاتے بلکہ رضاعی والدہ کی تمام لڑکیاں رضاعی بہنیں ہی ہیں۔ چونکہ یہ ایک بالکل بدیہی استنباط ہے اس لیے اس بارے میں ائمۂ سلف میں کامل اتفاق ہے۔ یہ کہنا بالکل غلط ہے کہ لڑکا جس لڑکی کے ساتھ دودھ پیتا ہے صرف وہی اُس پر حرام ہے اور لڑکی کی دوسری بہنوں سے نکاح جائز ہے۔ رضاعی بھائی بہن ہونے کے لیے ایک ماں کا ایک ہی وقت میں دودھ پینا لازمی شرط نہیں ہے۔ ایک ہی عورت جن بچوں کو مختلف اوقات میں بھی دودھ پلا دے وہ رضاعی بھائی بہن ہو جاتے ہیں۔

تعجب ہے آپ نے لکھا ہے کہ دو تین مثالیں آپ کے علم میں ایسی ہیں جن میں ایسے زوجین میں نکاح ہُوا ہے جنہوں نے ایک ساتھ تو دودھ نہیں پیا مگر آگے پیچھے ایک ہی والدہ کا دودھ پیا ہے۔ طبیعت باور نہیں کرسکتی کہ ایسا ہُوا ہوگا۔ لیکن اگر ایسا ہُوا ہے تو یہ بات انتہائی افسوسناک بلکہ شرمناک صورتِ حال کا پتہ دیتی ہے۔ اس کا صاف مطلب یہ ہے کہ مسلم معاشرہ اب اپنے دین کے

بارے میں اتنا بے شعور اور بے حس ہو گیا ہے کہ محرمات تک سے لوگ نکاح کر گزرتے ہیں اور اس بارے میں نہ تو وہ احکام شریعت کا خود علم رکھتے ہیں اور نہ ہی کسی صاحب علم کی طرف رجوع کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ پھر جب ایسے کبائر کے ارتکاب کا علم عام طور پر ہو جاتا ہے تب بھی بھری بستیوں میں کوئی اللہ کا بندہ ایسا نہیں نکلتا جو اگر علم دین رکھتا ہو تو خود فریقین کو ٹوکے یا اگر نہ رکھتا ہو تو کم از کم اتنی خلش ہی محسوس کرے جو اُسے کسی عالم سے پوچھ لینے پر آمادہ کرے۔ حرمتِ رضاعت حرمتِ نسب سے کچھ کم سنگین شے نہیں ہے۔ اس کا اندازہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد کے اس ایک واقعہ سے ہو سکتا ہے کہ ایک مرتبہ ایک صحابی اور ان کی اہلیہ کے بارے میں ایک عورت نے کہیں سے آکر بیان کیا کہ اُس نے ان دونوں کو دودھ پلایا ہے۔ صحابی آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کیا کہ یا رسول اللہ! ایک مجہول الحال عورت کا قول ہے، ہمیں اس کا کچھ علم نہیں ہے، کوئی مزید گواہ بھی موجود نہیں ہے اور میری ایک عمر اہل و عیال کے ساتھ بسر ہو چکی ہے۔ آپؐ نے یہ سب کچھ سُن کر فرمایا کہ "کیف وقد قیل" (اب کیا ہو سکتا ہے جب کہ ایسی بات کہہ دی گئی)۔ آپ کا مطلب یہ تھا کہ قانونِ شہادت کے تحت خواہ اس قول کا وزن ہو یا نہ ہو لیکن ایک کھٹک جو اس سے دل میں پیدا ہو جاتی ہے، اُس کا علاج سوائے تفریق کے اور کیا ہو سکتا ہے؟ چنانچہ صحابی نے فوراً سرِ تسلیم خم کیا اور تفریق کرا دی گئی۔

ضروری اعلان

جماعت کی ایجنسیوں اور مکتبوں کی اطلاع کے لیے عرض ہے کہ ادارۂ "چراغ راہ" کی مطبوعات اور تفہیم القرآن براہِ راست مرکزی مکتبہ سے طلب کریں۔ بلا لحاظ تعداد معقول کمیشن دیا جائے گا۔

مرکزی مکتبہ جماعت اسلامی پاکستان اچھرہ، لاہور

مطبوعات

نصرۃ القرآن | از مولانا عبد الحمید خاں صاحب ارشد۔ ناشر عبد المجید صدیقی یونائیٹڈ مجید موٹر کمپنی بندر روڈ کراچی۔ قیمت درج نہیں۔ صفحات ۲۳۵۔

دورِ حاضر کے فتنوں میں مسلمانوں کے لیے شاید سب سے زیادہ خطرناک فتنہ انکارِ حدیث ہے۔ اس کو پھیلانے والے دوسروں سے کسی قدر ہوشیار معلوم ہوتے ہیں اور جو جال انہوں نے بچھا رکھا ہے وہ اتنا ہم رنگِ زمین ہے کہ سادہ لوح مسلمانوں کو اس خطرے کا صحیح احساس نہیں ہوتا اس لیے بعض مسلمان اس کا آسانی سے شکار ہو جاتے ہیں۔

اس میں کچھ شبہ نہیں کہ قرآن حکیم نے تئیس سال کی مدت میں ایک خاص دینی ذہن پیدا کیا اور نہایت ہی اہم بنیادی حقائق کی چہرہ کشائی فرمائی اور ان تمام غلط فہمیوں کو دور کیا جو دینی تصورات کے گرد وپیش کسی نہ کسی طرح جمع ہو گئی تھیں۔ اس نے عبادات، معاملات اور معاشرت کے متعلق بھی ضروری اشارات ونکات پیش کیے۔ لیکن معاشرہ کو ایک نظم جس نے بخشا، اور دین کو اس کی تمام ثقافتی وتمدنی اقدار کے ساتھ جس نے مکمل طور پر قائم کر کے دکھایا وہ حضور سرورِ دو عالم کی ذات پاک تھی۔ حضورؐ کے اقوال اور آپ کی حیاتِ طیبہ کو ہی سنت وحدیث کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔ یہ کوئی بالکل الگ تھلگ قسم کی چیز نہیں، بلکہ درحقیقت قرآن پاک کی عملی تفسیر ہے۔ اس لیے ان دونوں کا باہمی تعلق اجمال وتشریح کا ہے، تباین وتضاد کا نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ وہ تمام مذاہب فقہی جن پر دوسری صدی کے اوائل سے لے کر تیسری صدی کے آخر تک، مختلف مدارس فکر کی عمارتیں کھڑی کی گئیں، ان میں سنت قدرِ مشترک کے طور پر تسلیم کی گئی، سب نے اس کی حجیت کو برابر مانا، یہی نہیں بلکہ اسے شریعت کی نہایت ضروری اساس قرار دیا۔ اس کا انکار نہ صرف چند اقوال کا انکار ہے بلکہ پورے دین سے انحراف ہے۔ اس میں ہمیں افصح العرب کی زبان کی عذوبت اور مٹھاس

ملتی ہے، حکمت، قول اور فلسفۂ عمل کی باریکیاں ملتی ہیں۔ معاشرت کے اصول ملتے ہیں اور یہی وہ ذریعہ ہے جس سے ہم اپنی ملی زندگی کی تاریخی کڑیوں کو جوڑتے ہیں، اور اپنے فکر و ذہن کو اس دورِ سعید تک لے جانے میں کامیاب ہوتے ہیں، جس میں نبوت نے پہلے پہل سانس لیا۔ اس سے انکار کرنے والے حضرات یہ تو دیکھتے ہیں کہ کچھ حدیثیں وضع کی گئیں مگر اس بات پر غور نہیں کرتے کہ وضع و تلبیس کی کارروائیوں سے اسے کچھ نقصان نہیں پہنچا بلکہ الٹا اس کے حاملین نے اس کے ڈھانچہ کو اور مضبوط اور نظام کو زیادہ مستحکم بنا دیا تاکہ کسی مفسد کا طائرِ وسوسہ بھی اس طرف پرواز نہ کر سکے۔ جو فرد یا جماعت بھی اس نظام کو ڈھانے کا ارادہ کرتی ہے وہ درحقیقت سارے دین کی بیخ کنی کے درپے ہے۔ اور جو شخص بھی اس کی مدافعت کرتا ہے وہ ستائش کا مستحق ہے۔ مولانا عبدالحمید صاحب آرشد کو خداوند تعالیٰ اجر دے کہ انہوں نے وقت کی نزاکت کو محسوس کرتے ہوئے اس اہم مسئلہ پر قلم اٹھایا۔ کتاب میں بحث کا آغاز جس اچھے طریقہ سے کیا گیا ہے، افسوس ہے کہ وہ سلسلہ آخر تک قائم نہیں رہا۔ کہیں کہیں غیر ضروری باتیں بھی درج کر دی گئیں۔ پھر جس سنجیدہ گفتگو اور پُر وقار لہجہ کی ضرورت تھی اُس کا بھی بعض جگہ خیال نہیں رکھا گیا۔ اغلاط کی کثرت بھی پڑھنے والے پر گراں گزرتی ہے۔ مگر اس کے باوجود جس محنت اور عرق ریزی سے مصنف نے اس اہم دینی فریضہ کو انجام دیا ہے ہم اس کے لیے یہی کہہ سکتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ مولانا کے علم و فضل میں برکت عطا فرمائے اور اس کوشش کو قبولِ عام بخشے اور انہیں توفیق دے کہ وہ دوسرا ایڈیشن نکالتے وقت ان خامیوں کو دُور کر سکیں۔

آلۂ مکبر الصوت | مصنفہ مفتی اعظم پاکستان مولانا محمد شفیع صاحب۔ ناشر: ادارۂ اشرف العلوم دارالاشاعت بندر روڈ کراچی ۱۔ قیمت ۸ آنے۔ صفحات ۴۴۔

مولانا موصوف کسی تعارف کے محتاج نہیں۔ دینی مسائل کو سمجھنے میں اُن کا مرتبہ اپنے ہمعصروں میں نہایت بلند ہے۔ زیرِ نظر رسالہ مولانا کی دقتِ نظر کا آئینہ دار ہے۔ یہ رسالہ پہلی مرتبہ ذی الحجہ ۱۳۵۸ھ میں شائع ہوا تھا اور اب اسے ۱۵ سال کے بعد دوبارہ شائع کیا گیا ہے۔ اس مرتبہ نظرِ ثانی میں بہت سی ترمیمات اور اضافات

جدیدہ شامل کی گئی ہیں جن حضرات کو اس سلسلہ میں رہنمائی کی ضرورت ہو وہ اس رسالہ سے حاصل کر سکتے ہیں اس کو دیکھنے سے جہاں ہمیں یہ خوشی ہوتی ہے کہ حامیانِ کتاب وسنت کس خرم واحتیاط اور محنت سے دین کی حفاظت کرتے ہیں وہاں ہمیں محبت بھرا گلہ یہ بھی ہے کہ کاش یہ بزرگ وقت کے زیادہ اہم مسائل کی طرف زیادہ سے زیادہ توجہ فرمائیں۔

تسہیل البیان فی توضیح القرآن | مصنفہ مولانا سلطان محمود صاحب ناظم مدرسہ خادم علوم نبوت کوٹھیارا شیخان ضلع گجرات قیمت ۱۲ آنے صفحات ۴۴۔ ملنے کا پتہ۔ مصنف سے براہِ راست حاصل کی جا سکتی ہے۔

اس مختصر سے رسالہ میں سورہ فاتحہ کی تفسیر درج ہے۔ مقدمہ میں فاضل مصنف نے لکھا ہے کہ اس سے ان کا مقصد انگریزی داں حضرات کو مطالبِ قرآنی سے آگاہ کرنا ہے۔ ہمیں افسوس ہے کہ وہ اپنے اس مقصد میں کامیاب نہیں ہو سکے۔ مولانا نے جن مباحث کو چھیڑا ہے وہ اگرچہ انگریزی پڑھنے والوں کے لیے دلچسپی کا باعث ہیں مگر جس طریق سے انہیں پیش کیا گیا ہے وہ اس طبقہ کو مطمئن کرنے کے لیے کافی نہیں۔ زبان پرانی ہے اور طباعت کا معیار بھی بلند نہیں۔ مگر یہ کوشش بذاتِ خود ایسی ہے جسے کوئی مسلمان سراہے بغیر نہیں رہ سکتا۔ مولانا علم دین میں خاصی مہارت رکھتے ہیں اور ان کی قابلیت ان صفحات میں نمایاں طور پر نظر آتی ہے۔ کاش مولانا اس کے لیے کوئی اچھا اسلوب بیان اختیار کریں۔

تفہیم القرآن جلد دوم

تفہیم القرآن جلد دوم کی طباعت کے متعلق دریافت کیا جا رہا ہے۔ فرداً فرداً جواب دینے کی بجائے ترجمان القرآن کے ذریعہ اعلان کیا جاتا ہے کہ :۔

تفہیم القرآن جلد دوم کے لیے ہمارا امپورٹ کردہ کاغذ کراچی پہنچ چکا ہے۔ جو ۲ ہفتہ تک لاہور پہنچ جائیگا۔ انشاء اللہ۔ اسکی طباعت وجلد بندی پر کم از کم تین ماہ صرف ہونگے۔ مکمل ہونے پر طلبِ آرڈر فرمائشوں کی تعمیل اُسی ترتیب سے کی جائے گی جس ترتیب سے ہمارے پاس فرمائشیں درج کرائی جا رہی ہیں۔

ناظم مکتبہ تعمیرِ انسانیت۔ ۲۵۰ گوجر گلی موچی دروازہ۔ لاہور

(بقیہ اشارات)

ارتقا دیا ہے، اور کچھ دوسرے انسان اپنی ضروریات، اپنے حالات اور اپنے نظریات کے تحت اسے بدل بھی سکتے ہیں اور اسے بالکل ختم کر کے نیا ڈھانچہ بھی کھڑا کر سکتے ہیں۔

اس ڈھانچہ کا سب سے بڑا پیچیدہ مسئلہ بینکنگ کا مسئلہ ہے جس کے ساتھ قرضہ جات، پراویڈنٹ فنڈ اور انشورنس کے نظام بھی وابستہ ہیں اور جس پر ہمارا موجودہ صنعتی و تجارتی سسٹم بھی چل رہا ہے۔ اگر ہم بینکنگ کے نظام کی نئی تشکیل اسلامی اصول کے مطابق کر سکیں تو باقی سارے متعلقہ سسٹم خود بھی اسی نئی تشکیل کے ساتھ اپنے آپ کو ڈھال کر ہم آہنگ کر لیں گے۔

"سود" کے بجائے اگر اسلام سے ہم "حصہ داری نفع و نقصان" کا اصول اخذ کر کے لائیں اور اس پر بینکنگ کے نظام کو استوار کرنا چاہیں تو ہمیں کچھ مشکلات بھی پیش آتی ہیں، لیکن ہم ان کو بالکل قابل حل پاتے ہیں

فراری ذہنیت کا دوسرا مظاہرہ یہ نمایاں خلا ہے کہ کتاب و سنت کے خلاف قانون سازی کرنے کا تو سدباب کیا گیا ہے لیکن مثبت طور پر کہیں یہ تسلیم نہیں کیا گیا کہ کتاب و سنت یا اسلامی شریعت ریاست پاکستان کے لیے بنیادی سرچشمۂ قانون ہیں۔ اس کا مطالبہ شروع سے تھا، اور پہلی دستوری رپورٹ کے سامنے آنے پر بھی اس طرف خصوصی توجہ دلائی گئی تھی۔ لیکن یہ بھاری خلا پھر بھی برقرار رکھا گیا ہے۔ حالانکہ دفعہ ۳ جس شے کے تحفظ کی منفی تدبیر پیش کرتی ہے، پہلے دستور میں اسے نمایاں اثباتی طور پر قائم کیا جانا چاہیے تھا۔ اس کی ایک شکل یہ تھی کہ خود اسی تحفظ کی دفعہ میں اسے شامل کر دیا جاتا، دوسری شکل یہ تھی کہ اسے رہنما اصولوں میں ملے لیا جاتا۔ اور ایک تیسری صورت یہ بھی ہو سکتی ہے کہ اسے عدلیہ (JUDICIARY) کے باب میں جگہ دے دی جاتی۔ آخر کہیں نہ کہیں اس حقیقت کو شامل دستور ہونا چاہیے تھا تاکہ ہمارے ادارہ ہائے قانون ساز اور ہمارے نظام انصاف کے کارپرداز اس سے ذہنی رہنمائی حاصل کرتے۔ اس مثبت حقیقت کے دستور میں شامل ہونے ہی سے کسی مجلس قانون ساز میں بحث و فکر کا محور کتاب و سنت قرار پا سکتے ہیں اور اسی کے ذریعے جج اس کے پابند ہو سکتے ہیں کہ وہ قانون کے تحت فیصلے قائم کرتے ہوئے کتاب و سنت کو اولین اہمیت دیں

کہا جاتا ہے کہ چونکہ زندگی کی ضروریات کے تمام کے تمام تفصیلی قوانین کتاب و سنت میں موجود نہیں ہیں، لہٰذا ایسی پابندی قبول کر لینے کے بعد قانون کے ارتقاء میں بڑی رکاوٹ پیدا ہو جائے گی۔ یہ عذر خود بتاتا ہے کہ اسے پیش کرتے ہوئے مطالبے پر ہرگز توجہ نہیں دی گئی۔ مطالبہ یہ ہے کہ کتاب و سنت کو "بنیادی سرچشمۂ قانون" (CHIEF SOURCE OF LAW) قرار دیا جائے اور باقی سارے مآخذ قانون اس کے تابع رہیں۔ آخر پہلے بھی نظام اسلامی چلا ہے تو اجتہاد اور قیاس کے دائروں میں مختلف مآخذ سے استفادہ کیا گیا ہے نیز مباحات میں جو آزادی حاصل ہے اسے "مصلحت اسلام و مسلمین" کے معیار کے تحت پوری طرح استعمال کیا جاتا رہا ہے۔ اجتہاد اور قیاس اور اباحت کے بارے میں تو خود ہمارے بنیادی سرچشمۂ قانون ہی میں ہدایات موجود ہے۔ بہرحال ہم ضروری سمجھتے ہیں کہ اس کوتاہی کو دور کر دیا جائے۔

باب دوم میں جو رہنما اصول پاس کیے گئے ہیں، ان کی دفعہ ۲ کے تحت فواحش و منکرات اور ربٰو کے سدباب کے کام کو کسی مدت کی تحدید سے آزاد کر دیا گیا ہے اس متعین اصلاحی کام کو جو ہر طرح قابلِ عمل بھی ہے، غیر معین مدت تک ٹالتے رہنے کی گنجائش اچھی علامت نہیں ہے۔

اسی طرح اسلامی اصولوں پر انصاف کی بلا معاوضہ بہم رسانی کی جو ذمہ داری دفعہ ۲ کی شق ۸ میں ایک رہنما اصول کی حیثیت سے کر دستوری رپورٹ میں ریاست کے سر ڈالی گئی تھی، اسے رپورٹ کو پاس کرتے ہوئے پھر ختم کر دیا گیا ہے۔

اور یہ کرشمہ بھی بڑی حد تک فراری ذہنیت کا ہے کہ دستوری رپورٹ کو زیر بحث لا کر پورے کام کو ختم کیے بغیر اس کا ایک ہی حصہ پاس کر کے ہمارے دستور ساز بزرگ ایوان پر تعطل کے تالے ڈال کر رخصت ہو گئے ہیں۔ ان کو ملک کے دستور کا مسئلہ اتنا عزیز نہیں ہے جتنا کہ ملک کے ایک حصے کے انتخابات کو جیت لینے کے لیے وہ بے چین ہیں۔ دستور سازی کو وہ بار بار معرضِ التواء میں ڈالنے کے عادی ہیں لیکن ایک صوبے کے انتخابات کو چند روز کے لیے ملتوی نہیں رکھ سکتے۔ دستور سازی کا تھوڑا سا کام عوام کے مطالبے کے مطابق کرنے کے بعد وہ اپنے اس کارنامے کی متاع کو لے کر فوراً ووٹوں کی منڈی میں جا پہنچے ہیں تاکہ نقداً نقد جو دام کھرے ہو سکتے ہوں وہ کر لیے جائیں۔ حالانکہ صحیح اور معقول صورت یہ تھی کہ دستور سازی کا کام تیز رفتاری سے مکمل کر کے نئے اسلامی دستور کو زیادہ سے زیادہ ۱۵ راگست سے نافذ العمل کر دیا جاتا اور مرکز اور سارے صوبوں کے انتخابات نفاذِ دستور کے بعد منعقد ہوتے۔

بہرحال ہم اب بھی مسلم لیگ کی موجودہ حکمران اور نمائندہ طاقت سے اپیل کرتے ہیں کہ وہ دستور کے اس تعطل کو ختم کرے اور فروری کے اجلاس دستوریہ میں پوری رپورٹ کو پاس کر کے اس کی ترتیب و تدوین کا کام بھی جلد مکمل کرے۔ اور عوام کو ہم توجہ دلاتے ہیں کہ جس طرح اب تک انہوں نے منظم اور پُرامن جدوجہد کے ذریعے دستور سازی کے میدان میں اتنی کامیابی حاصل کی ہے اسی طرح وہ مذکورۂ بالا کمزوریوں کو دور کرانے اور دستوریہ سے رپورٹ کے بقیہ حصے سے متعلق اپنے مطالبات منوانے اور آزادی کی آئندہ سالگرہ سے نئے دستور کو نافذ کرانے کے لیے ایک بار اور سرگرم عمل ہو جائیں۔

OUR ENGLISH LITERATURE :

1. **Towards understanding Islam**—By Sayyed Abulala Maudoodi—This book is a first approach to a systematic and logical understanding of Islam and a good helper to its more extensive study. PP. 231–Price Rs. 3/8

2. **Nationalism & India**—By Sayyed Abulala Maudoodi —This treatise deals with nationalism and its bearing on Islamic ways of thought and life, and present social and political problem in India. PP. 72–Price As. 12

3. **Political Theory of Islam**—By Sayyed Abulala Maudoodi—Basic theory of State in Islam and some of its important features are brought out in this pamphlet. PP. 64–Price As. 12

4. **Process of Islamic Revolution**—This pamphlet explains how movement of Islam transforms its followers individually and collectively and how a true Islamic State necessarily follows. PP. 56–Price As. 12

5. **Economic Problem of Man & Its Islamic Solution** —By Sayyed Abulala Maudoodi. PP. 56–Price As. 12

6. **The Ethical View-Point of Islam**—By Sayyed Abulala Maudoodi—The original was delivered as a lecture in Islamia College, Peshawar on 26th February, 1944 PP. 56–Price As. 12

7. **The Message of Jama'at-e-Islami**—By Sayyed Abulala Maudoodi—The original was delivered in a gathering of the Jama'at which was held on 9th & 10th May, 1947 in Dar-ul-Islam, Pathankot. PP. 36–Price As. 8

8. **What is Islam ?**—By Mohammad Mazhar-ud-Din Siddiqi. PP. 96–Price Re. 1/8

9. **After Secularism what ?**—By Mohammad Mazhar-ud-Din—The aim of this brochure is to present the true conception of God and its practical requirements. PP. 56–Price As. 12

Can be had from

MAKTABA-E-JAMA'AT-E-ISLAMI

LAHORE
(Pakistan)

دعوت دین اور اس کا طریق کار

از مولانا امین احسن اصلاحی

مولانا اصلاحی نے اس کتاب میں ایک طرف تو موجودہ طریقہ تبلیغ کی خامیوں کو واضح کیا ہے' اور دوسری طرف انبیا علیہم السلام کے طریقہ تبلیغ' طریقہ تربیت اور دعوت دین کے مکمل طریق کار پر مفصل اور مدلل روشنی ڈالی ہے ۔

جو لوگ اسلام کو ایک ہمہ گیر نظام زندگی کی حیثیت سے پھر زندہ و کارفرما دیکھنا چاہتے ہیں اور اس مقصد کے لئے اسی طریقہ پر کام کرنے کو صحیح سمجھتے ہیں جو انبیائے کرام نے اپنے اپنے زمانے میں ہدایت خداوندی کے تحت اختیار کیا تھا ، اس کتاب میں اپنے لئے بہت کچھ پائیں گے ، اور اس کے مطالعے سے محسوس کرینگے کہ ان کی راہ کے بہت سے پتھر ہٹ گئے ہیں اور بہت سی تاریک راہیں روشن ہو گئی ہیں ۔

پاکستان ـــ جو اسلام کے نام پر حاصل کیا گیا تھا ، اور جسکو قرارداد مقاصد کے ذریعہ اسلام کے نظام زندگی کے لئے مخصوص کر دیا گیا ہے ، اس بات کا حقدار ہے کہ اس کے باشندے اپنے اندر ان صفات کو پرورش دیں جو اسلام کی دعوت کے لئے ضروری ہیں ، تا کہ وہ اسلام کو صرف اپنے ملک میں حاکم و حاوی بنانے کی جد و جہد کریں بلکہ دوسرے ممالک کے مسلمانوں کے لئے بھی مشعل راہ بن سکیں ۔

ہمیں توقع ہے کہ یہ کتاب اس مقصد میں مدد گار ثابت ہو گی

جلد شائع ہو رہی ہے

ارتداد کی سزا

اسلامی قانون میں

از مولانا ابو الاعلیٰ مودودی

یہ کتابچہ مولانا سید ابوالاعلیٰ صاحب مودودی کے ان مضامین پر مشتمل ہے جو مولانائے محترم نے وقتاً فوقتاً رسالہ ترجمان القرآن میں لکھے تھے ۔

مسلمانوں نے مغرب سے مرعوب ہو کر اسلام کے جن مسائل کو شبہہ اور شرم کے ملے جلے جذبات سے دیکھا اور شکست خوردہ ذہنیت کے لوگوں نے جنکو اسلام سے خارج ہی سمجھنا شروع کر دیا ان مسائل میں سے ایک مسئلہ ارتداد کا ارتکاب کرنے والے کی سزا سے بھی متعلق تھا ۔

مولانا مودودی نے اس مسئلہ پر پوری مدلل روشنی ڈالی ہے اور اس کا مطالعہ علم سیاسیات سے دلچسپی رکھنے والے ہر شخص کے لئے مفید ثابت ہوگا ۔

ملنے کا پتہ ، جلد شائع ہو رہی ہے

مرکزی مکتبہ جماعت اسلامی اچھرہ ۔ لاہور ۔ پاکستان

سرورق رہبر پریس ' لاہور میں چھپا